قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدّین اکبر

ناشر: عطاءُ الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

فہرست مضامین

۱	لمعات	ادارہ	۲
۲	ختمِ نبوّت اور پرویزؒ	محمد عمر دراز	۹
۳	قرآنِ کریم اور اکیسویں صدی....	ثریا عندلیب	۱۳
۴	حرفِ اوّل	محمد علی بیگ	۲۷
۵	قانونِ مکافاتِ عمل	بشیر احمد عابد	۳۶
۶	فریضۂ رسالت	علی محمد چدھڑ	۴۱
۷	ایمانی وحدت اور یہود و نصاریٰ	محمد ارشاد	۴۶
۸	میں وصیت کرنا چاہتا ہوں	عبداللہ ثانی	۵۱
۹	حقائق و عبر	ادارہ	۶۷
۱۰	عیدالاضحیٰ	قاسم نوری	۷۳
۱۱	HOUSE OR HOME	شمیم انور	۸۰

اگلے شمارہ میں: پرویزؒ کی صدی

جلد ۴۴ ——— جون ۱۹۹۱ء ——— شمارہ ۶

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

کتابت: خلیل ساکر

لمعات

سُنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تو اسے دنیاوی قوتیں عطا کیں اور ان کے ساتھ ہی عقل و شعور کا مادہ بھی۔ لیکن جس طرح اس کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اسی طرح اس کی عقل و فکر کی بھی ایک حد ہے اس کی جسمانی قوتوں کی محدودیت کی کمی پوری کرنے کے لئے اس کی عقل نے آلات ایجاد کئے (جس چیز تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا یہ اس تک سیڑھی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے) لیکن اس کی عقل کی محدودیت کی کمی یہ خود پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اپنی طرف سے راہنمائی دی جائے۔ اس راہنمائی کی شرح یہ نہیں تھی کہ ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے کہ زندگی کا فلاں راستہ صحیح ہے اور فلاں غلط۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کر لیتا اور اسے وحی کے ذریعے بتا دیتا کہ نوعِ انسانی کے لئے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس وحی میں نہ تو اس منتخب فرد کی اپنی عقل و بصیرت کا کوئی دخل ہوتا اور نہ ہی اس کے کسب و ہنر کا کوئی واسطہ۔ اسے وحی براہِ راست خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی۔ خدا کی طرف سے اس طرح وحی ملنے کے منصب کو منصبِ نبوّت کہا جاتا ہے اور حاملِ وحی کو نبی۔

وحی کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ انہوں نے اس دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کیسے ہونا چاہیئے۔ مختصر الفاظ میں وحی کا مقصود یہ بتانا تھا کہ انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا جب تک اس نقشہ کی عملی شکل قائم کر کے نہ دکھا دی جائے اور انسانوں کو اس پر چلا کر یہ بتا نہ دیا جائے کہ وحی جس زندگی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ناممکن العمل نہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر نبی کے ذمہ یہ فریضہ بھی تھا کہ وہ

وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور عملاً بتائے کہ اس کے مطابق زندگی کا نقشہ کیسے مرتب ہوگا۔ نبی کے اس منصب کو منصبِ رسالت کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہم نے نبوّت اور رسالت کے مناصب کا یہ فرق اس منتخب فرد کی دو حیثیتوں کو سمجھانے کے لئے بیان کیا ہے۔ ورنہ نبی، رسول ہوتا ہے اور رسول نبی ہوتا ہے۔ قرآن میں ایک ہی فرد کے لئے کہیں نبی اور کہیں رسول کا لفظ آیا ہے لیکن مقصدِ پیشِ نظر کے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس فرق کا سامنے رکھنا ضروری ہے یعنی خدا سے وحی ملنے کا منصب، منصبِ نبوت ہے اور وحی کو دوسروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق عملی نظام قائم کرنا منصبِ رسالت۔ مقصد اس تمام پروگرام کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلایا جائے اس کو خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مختلف انسانوں نے مل کر ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہو تو اس نظام کا کوئی مرکز بھی ہونا چاہیئے۔ جب رسول وحی کے نقشے کے مطابق نظام قائم کرتا تو اس نظام کا مرکز خود اس رسول کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان تمام افراد کے لئے جو وحی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کر کے اس نظام کے اجزاء بنتے تھے۔ اس رسول کی اطاعت ضروری ہوتی تھی۔ یہ اطاعت درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہوتی تھی۔ کیونکہ رسول اپنی ذات کی نہیں بلکہ خدا کے قوانین ہی کی اطاعت کراتا تھا۔ لہٰذا وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رسول کی اطاعت کے بغیر خدا کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ نبوت و رسالت چلا آ رہا تھا۔ تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں سرزمینِ حجاز میں نبیٔ اکرم مبعوث ہوئے۔ ان پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایسی مکمل تھی کہ اس کے بعد نوعِ انسانی کے لئے مزید وحی کی ضرورت نہ رہی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضور کی ذات پر نبوّت کا خاتمہ کر دیا اور آپ پر نازل کردہ وحی کو قرآن کی شکل میں منضبط کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس سے نبیٔ اکرمؐ کے منصبِ نبوّت کی بھی تکمیل ہو گئی اور نفسِ مضمون کا اختتام بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو خاتم النّبیین قرار دیا ہے۔ اب رہا فریضۂ رسالت۔ سو اس کے لئے حضور نے وحی کے ذریعہ بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق ایک نظام تشکیل کیا۔ اس نظام کی بنیاد اس نظام کے مرکز یعنی خود رسول اللہ کی اطاعت پر تھی۔ رسول اللہ اس نظام کو واضح اور نکھری ہوئی صورت میں امّت کو دے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیا کو بتا گئے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ کس قسم کا ہوتا ہے

رسولؐ اللہ کی وفات سے نبوّت کا سلسلہ تو ختم ہوگیا لیکن وحی کے مطابق نظام کو تو (بہرحال آگے چلنا تھا۔ اس نظام کو) جماعت مومنین نے قائم رکھا۔ اور رسول اللہ کی بجائے خلیفۃ الرسول، حضرت ابوبکرؓ صدیق کو اس نظام کا مرکز منتخب کیا۔ اب افرادِ امّت کیلئے اس مرکز کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تھی اور خلیفۃ الرسول کے سامنے خدا کا قانون (قرآن کی شکل میں موجود تھا) اور اس کے علاوہ وہ منہاج و مسلک جس کے مطابق رسول اللہ نے اس نظام کو متشکل فرمایا اور آگے چلایا تھا۔ رسول اللہ کے اس عملی طریقہ کا نام "سنّتِ رسول اللہ" تھا۔ سنّت کے معنی ہی طریقہ ہیں۔

رسولؐ اللہ نے اپنی ۲۳ سالہ رسالت کی زندگی میں اس نظام کو بتدریج متشکل فرمایا تھا۔ اس لمبے عرصہ میں حالات میں کافی تغیّر و تبدّل ہوا۔ جس دن حضورؐ نے اس دعوت کیلئے پہلی آواز بلند فرمائی اور جس روز آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے درمیانی عرصہ میں یہ کاروانِ رشد و سعادت مختلف منازل میں سے گزرا۔ حضورؐ ایک راہ شناس اور واقف منزل میرِ کارواں کی طرح ان تمام منازل و مراحل میں اپنی خداداد بصیرت اور رفقائے کار (صحابہ) کے مشورہ سے۔ حالات کے تقاضے کے مطابق عملی نقشے بناتے اور وقت اور موقعہ کے مناسب ہدایات نافذ فرماتے۔ مقدسین کے اس قافلہ کو آگے بڑھاتے گئے مثلاً نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی پہلے ہر نماز میں دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ بعد میں ان میں اضافہ ہوا۔ مشکوٰۃ۔ بحوالہ مسلم و بخاری) یا مکّہ میں نماز کے لئے اذان کا قاعدہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء مدینہ میں جاکر صحابہؓ کے مشورہ سے ہوئی (بخاری) ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ اس کے بعد کچھ عرصہ اور بھی اس دنیا میں تشریف رکھتے تو آنے والے حالات کے مطابق کہیں پہلے نقشوں میں ردّ و بدل فرماتے اور کہیں جدید نقشوں کا اضافہ فرماتے۔ لیکن حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ ردّ و بدل منقطع نہیں ہوا بلکہ آپ کے خلفائے راشدینؓ اسے انہی خطوط پر آگے بڑھاتے گئے۔ یعنی اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اس مناسب ردّ و بدل کو نہ خلفائے راشدین نے خلافِ سنّتِ رسول اللہؐ سمجھا نہ صحابہ کبارؓ نے اسے ایسا قرار دیا (مثال کے طور پر) جب حضرت عمرؓ نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شام اور فلسطین کی مفتوحہ اراضی فوج میں تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہے گی تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ فیصلہ خلاف سنّتِ رسول اللہؐ ہے۔ یا جب آپ نے وظائف کو عملی قدر مراتب بڑھایا گھٹایا تو کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب رسول اللہؐ نے ان میں مساوات کو قائم رکھا تھا تو آپ ان میں ردّ و بدل کیسے کر سکتے ہیں[1]

---

[1] ہم نے صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس قسم کے متعدّد واقعات ہیں جن میں عہدِ نبویؐ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

——— اس لئے کہ وہ حضرات اس حقیقت سے واقف تھے کہ حالات کے مطابق اس قسم کا ردّ و بدل خود سنّتِ رسول اللہؐ کی اتّباع ہے۔ اس لئے کہ حضورؐ خود حالات کے مطابق نظام کے نقشے میں ردّ و بدل فرماتے رہتے تھے۔ البتہ جن امور میں حالات کے تقاضے کسی تبدیلی کے داعی نہیں ہوتے تھے وہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیتے تھے۔ ان میں ان ہی نقشوں کے مطابق چلتے رہنا، اتّباعِ سنّت تھا۔ یعنی اس نظام کے مرکز کے لئے وحی کی روشنی میں اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق نظامِ خداوندی قائم رکھنا، اتّباعِ سنّت تھا۔ اور افرادِ امّت کے لئے اس مرکزِ نظام کے فیصلوں کی اطاعت کرنا، اطاعتِ خدا اور رسول کے مرادف۔ یاد رہے کہ خلفائے راشدینؓ کی عمل میں لائی ہوئی تبدیلیاں بھی سنّت کے مفہوم میں داخل ہیں چنانچہ جمعہ کی پہلی اذان جو حضرت عثمانؓ نے شروع فرمائی تھی اور نماز تراویح کی جماعت جو حضرت عمرؓ نے شروع کی تھی سنّت تسلیم کی جاتی ہیں۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو اطاعتِ خداوندی اور اتباعِ سنّت کا یہ عملی نقشہ آگے بڑھتا رہتا لیکن ہماری بدقسمتی سے یہ سلسلہ تھوڑے عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا۔ اب آپ اس مقام پر آجائیے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ اس وقت ہماری صورت یہ ہے کہ

۱ وہ اسلامی نظام موجود نہیں ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متشکل فرمایا تھا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ ہم اس وقت بالکل انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں جو وحی کی منشاء اور سنّتِ رسول اللہؐ کے خلاف ہے۔

۲ ہمارے پاس قرآن ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسولؐ اللہ کو بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

۳ ہمارے پاس سنّتِ رسول اللہؐ یا آثارِ صحابہؓ کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے خود رسول اللہؐ یا خلفائے راشدینؓ نے مرتّب کرایا ہو۔

۴ ہمارے پاس روایات کا ایک ذخیرہ ہے جو نبی اکرمؐ اور عہدِ صحابہؓ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے (چنانچہ ان میں سب سے اہم کتاب صحیح بخاری جو تیسری صدی ہجری میں مدوّن ہوئی تھی، کا نام خود امام بخاری نے "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وایامہ" رکھا تھا) لیکن یہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کے فیصلوں میں بعد میں عند الضرورت ردّ و بدل کیا گیا۔ اس قسم کی ایک تبدیلی (تطلیقِ ثلاثہ) کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ عہد حضرت عمرؓ کی سیاست کا یہی تقاضا تھا کہ ایسا ہی کیا جاتا۔

ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مجموعوں میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ اصل بھی ہیں اور وضعی بھی۔ باہم متناقض و متخالف روایات بھی موجود ہیں جو ہو سکتا ہے کہ مختلف ادوار سے متعلق ہوں جنہیں آج ہم متعیّن نہیں کر سکتے۔ ایسی روایات بھی ہیں جو اپنے سیاق و سباق سے کٹی ہوئی ہیں۔ یا جن میں ادھوری بات بیان ہو گئی ہے اور اس طرح بات کچھ سے کچھ بن گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بھی ہیں جنہیں ہم کسی طرح بھی حضور رسالت مآب کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ایسی ہی روائتیں ہیں جن کے متعلق (اور تو اور) مولانا ابوالکلام آزاد جیسا اہلِ حدیث بھی اس کا اعتراف کرتا ہے' (اور ان کا یہ اعتراف صحیح بخاری کی ایک روایت پر تنقید کے سلسلے میں ہے) کہ

"روایات کی قسموں میں کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روائت ہو۔ بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کیلئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلے میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔" (ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۰)

روایات کے مجموعوں کے متعلق جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں۔

"یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنّتِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ اس پر بالکل اعتماد کر لیا جائے۔"

سوال یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ یہ کس طرح متعیّن کیا جائے کہ صحیح سنّتِ رسول اللہؐ اور آثارِ صحابہ کیا ہیں۔ اس لئے کہ جب تک یہ متعیّن نہ ہو جائے کون کہہ سکتا ہے کہ سنّتِ رسول اللہؐ کی صحیح ترین شکل یہ ہے اس تعیّن کی صورت یہ ہے کہ:

۱ سنّتِ رسول اللہؐ کا ایک بڑا حصّہ خود قرآن کے اندر ہے جو یقینی طور پر صحیح ہے۔

۲ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے اسے پرکھنے کا معیار بھی خود قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ قرآن ہی پر عمل کیا کرتے تھے اور انہوں نے اس کے مطابق عملی نظام تشکّل فرمایا تھا۔

۳ اس ذخیرہ کو پرکھنے کا کام زید۔ بکر۔ عمر کے ذاتی طور پر کرنے کا نہیں۔ اس لئے کہ کسی فرد کو یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے افرادِ امّت سے کہے کہ جس بات کو میں سنّتِ رسول اللہؐ

اس کی اتباع تم پر فرض ہے اگر تم اس کی اتباع نہ کرو گے تو تمہیں منکرِ رسالت قرار دے دیا جائیگا۔

اس تعین کے لئے ضروری ہے کہ امت قرآن کی روشنی میں پھر سے وہی نظام قائم کرے جسے رسول اللہ نے قائم فرمایا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ اس نظام کا یہ کام ہو کہ وہ کتب روایات کے اس تمام ذخیرے کو قرآن کی روشنی میں پرکھے اور پھر (ہمارے لئے) متعین کر دے کہ اس کی رُو سے سنتِ رسول اللہؐ کی سب سے زیادہ صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے۔ وہ قرآن کے قوانین اور اس طرح متعین کردہ سنت رسول اللہؐ کی روشنی میں امت کو چلائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو اس زمانے کے حالات کے مطابق اس سنتِ رسول اللہؐ میں ضروری تبدیلی کرتا چلائے، جس طرح خلفائے راشدینؓ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اس سنتِ رسول اللہؐ میں تبدیلیاں کی تھیں۔

۵ جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اس وقت تک جس طرح امت انفرادی طور پر سنتِ رسول اللہؐ کا اتباع کرتی آ رہی ہے اسی طرح کیا جائے (تاکہ امت انتشار سے بچی رہے) اس میں صرف اتنا دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو۔ اس لئے کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہوگا وہ خود سنتِ رسول اللہؐ کے بھی تو خلاف ہوگا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن ہی کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دا سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت و سکون سے غور فرمائیں۔ عام حالات میں خود فکر و نظر کی توہین ہے۔ لیکن اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر سکوت و سکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور اتباعِ سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل کئے بغیر ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں بیٹھے گا۔

جو حضرات یا جماعتیں، طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث پکار کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آ رہی ہیں۔ ان سے بھی ہماری باادب درخواست ہے کہ وہ ازراہِ کرم صرف اتنا بتا دیں کہ جو کچھ یہ لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے اور اگر غلطی ہے تو کہاں۔ اس کیلئے کسی لمبے چوڑے مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں فقط اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ فلاں مقام غلط ہے اور اس کی جگہ صحیح پوزیشن یہ ہے، اس طرح کے غور و فکر کے بعد یہ متعین ہو جائے کہ سنتِ رسول اللہؐ کسے کہتے ہیں وہ کہاں سے او

کس طرح حاصل ہوگی اور اس پر عمل کیسے ہوگا۔ تو اس سے ایک بہت بڑے سوال کا حل مل جائے گا۔ جس کے متعیّن نہ ہونے سے اس وقت قوم عجیب الجھن میں ہے اور جس کی وجہ سے اس کی بہت سی توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں۔

کیا اربابِ فکر و نظر اس طرف توجّہ فرمائیں گے ؟

محمد عمر دراز

ختمِ نبوّت اور پرویزؒ صاحب

مشہورِ زمانہ مقدمہ بہاولپور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک زیرِ سماعت رہا۔ اس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا خاوند بہ تبدیلیٔ مذہب قادیانی، مرزائی ہوگیا ہے۔ اس لئے مدعیہ کا اس سے نکاح فسخ قرار دیا جائے۔

اس مقدمہ کا تاریخی فیصلہ ضلع بہاولپور کے ڈسٹرکٹ جج جناب محمد اکبر صاحب نے ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو سنایا تھا جس کی رُو سے پہلی دفعہ ایک عدالت کی طرف سے یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ:

"مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخِ ارتداد سے فسخ ہو چکا ہے۔"

اس تاریخی فیصلہ کی بنیاد پرویزؒ صاحب کے ایک مضمون "میکانیکی اسلام" میں مقامِ نبوّت کی تشریح و تعبیر تھی۔ پرویزؒ صاحب نے اس کا اجمالی ذکر اپنی کتاب "ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیت" میں کیا ہے:

ہمیں ایک عرصہ سے تلاش تھی کہ کہیں سے مقدمہ بہاولپور کی رُوداد یا کم از کم فاضل جج کے فیصلہ کا مکمل متن حاصل ہو جائے تو اسے طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لیا جائے۔ تاکہ پرویزؒ صاحب کے محولہ مضمون کی وہ خصوصیت سامنے آجائے جس کی بنا پر فاضل جج نے یہ فیصلہ سنایا تھا۔ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود ہمیں کامیابی نہ ہوئی اور جو کچھ دستیاب ہو سکا وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جس کا تذکرہ پرویزؒ صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

حال ہی میں اسلامک فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) ۱۔ ڈیوس روڈ لاہور نے اس مقدمہ کی مکمل رُوداد تین جلدوں میں "رُوداد مقدمہ مرزائیہ بہاولپور ــــ ۱۹۲۶ء لغایت ۱۹۳۵ء" کے نام سے شائع کی ہے (کتاب پر تاریخ طبع اکتوبر ۱۹۸۸ء ہے)۔ محترم شیخ اللہ دتّا صاحب کے حسنِ توسّط سے ہمیں یہ کتاب ملی اور اس طرح اس تاریخی فیصلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی تحریر کا اصل حوالہ ہمارے سامنے آیا جو پیشِ خدمتِ قارئین ہے:-

"یہاں میں یہ درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس لئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کرسکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ و پکار کی جارہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کردی جائے۔

مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف بیان نہیں کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا رہا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر نبی رسول ہوتا ہے۔ اور نبی کے لئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے بحوالہ براہین صفحہ ۸۹ بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہے جسے اللہ تعالےٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجتا ہے بخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لائے یا نہ لائے رسول کے لئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے کہ جو صاحب کتاب ہو۔ یا شریعت سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کرے۔

یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھیں۔ اس لئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحات قرآن کی رُو سے تمام لوازم نبوت پر حاوی ہو۔ اس سلسلہ میں مجھے مولانا محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کی کتاب دین و آئین دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے معترضین کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے نبوت کی حقیقت یہ بیان کی کہ جس شخص کے دل میں کوئی نیک تجویز بغیر ظاہری وسائل اور غور کے پیدا ہوں۔ ایسا شخص پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور اس کے خیالات کو وحی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تعریف بھی مجھے دلچسپ معلوم نہ ہوئی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانیکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمد پرویز میری نظر سے گزرا اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آج کل کے معقولیت پسندوں کی جماعت کے نزدیک رسول کا تصور یہ ہے کہ وہ ایک سیاسی لیڈر اور ایک مصلح قوم ہوتا ہے۔ جو اپنی قوم کی نکبت اور زبوں حالی سے متاثر ہوکر انہیں فلاح و بہبود کی طرف بلاتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اندر انضباط و ایثار کی رُوح پھونک کر زمین کے

بہترین خطوں کا ان کو مالک بنا دیتا ہے۔ اس کی حقیقت قوم کے ایک امیر کے قسم کی ہوتی ہے جن کے ہر حکم کا اتباع اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ انحراف سے قوم کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور وہ دنیاوی نعمتیں جو اس کے حسن تدبیر سے حاصل ہوئی تھیں ان کے چھن جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

اس کا حسن تدبر، عقل، حکمت ذہنی انسان کے ارتقاء کی بہترین کڑی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول کا بہترین مفکر شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت ریاضت سے برائی کی قوتیں اس سے سلب ہو جاتی ہیں اور نیکی کی قوتیں نمایاں طور پر ابھر آتی ہیں۔ انہی قوتوں کا نام ان کے نزدیک ابلیس اور ملائکہ ہے" ــــــ

ــــــ اس کا جواب پھر انہوں نے بحوالہ آیاتِ قرآنی یہ دیا کہ :

" رسول بلا شبہ مصلح اور مدبرِ ملت ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت دنیاوی مصلحین اور مدبرین سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ دنیاوی مفکرین و مدبرین اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور ان کا فلسفۂ اصلاح و بہبود ان کی اپنی پروازِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے جو کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے انبیاء کرام مامور من اللہ ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ اس دنیا میں خاص مشیّت باری تعالیٰ کے ماتحت چلتا ہے۔ وہ نہ اپنے ماحول سے متاثر اور نہ احوال و ظروف کی پیداوار ہوتے ہیں بلکہ ان کا انتخاب مملکتِ ایزدی سے ہوتا ہے اور ان کا سرچشمۂ علوم و ہدایت علمِ باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ جس میں کسی سہو و خطا کی گنجائش نہیں۔ ان کا سینہ علم لدنی سے معمور اور ان کا قلب تجلیاتِ نورِ ازلی سے منور ہوتا ہے۔

دنیاوی سیاست و تفکر صفت ہے جو اکتساباً حاصل ہوتی ہے اور مشق و مہارت سے یہ ملکہ بڑھتا ہے۔ لیکن نبوت ایک موہبتِ ربانی اور عطائے یزدانی ہے جس میں کسب و مشق کو کچھ دخل نہیں۔ قوم و امت کی ترقی ان کے بھی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ لیکن سب سے مقدم اخلاقِ انسانی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ اس کا پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتا ہے اور وہ تمام انسانوں کو راستہ دکھلانے والا اور ان کا مطاع ہوتا ہے۔ اس کی

اطاعت میں خدا کی اطاعت اور اس کی معصیّت خدا کی معصیّت ہے اور جو لائحہ حیات اس کی وساطت سے دنیا کو ملتا ہے اس میں کوئی دنیاوی طاقت ردّ و بدل نہیں کرسکتی۔ بلکہ دنیا بھر کی عقول میں جہاں کہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ بھی اس کی مشعلِ ہدایت سے ہوسکتا ہے۔ ان کو خدائی پیغام ملائکہ کی وساطت سے ملتے ہیں، جو اگرچہ عالمِ امر سے متعلق ہونے کی وجہ سے سرحدِ ادراکِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ لیکن ان کا وجود محض انسان کی ملکوتی قوتیں نہیں ہیں۔"

(ص ۵۳ تا ص ۵۵)

"قرآنِ حکیم میں حیاتِ انسانی کی پوری انتہا واضح نہیں فرمائی گئی۔ اور جیسا کہ چوہدری غلام احمد پرویز صاحب مضمون محولہ بالا میں لکھتے ہیں۔ جنّت بھی جو بالعموم منزلِ مقصود سمجھی جاتی ہے۔ درحقیقت اصل منزلِ مقصود نہیں بلکہ راستہ کا ایک خوشنما منظر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں جنّتیوں کی اس دعا سے ظاہر ہوتا ہے۔ یقولون ربنا اتمم لنا نورنا۔ اس منتہٰی کو ایک راز رکھا گیا۔ نہ معلوم کہ حضور کے فیض سے امّت کو کیا کچھ عطا فرمایا جائے۔"

(ص ۶۸)

یہ کتاب ان جگہوں سے دستیاب ہوسکتی ہے :۔

۱ اسلامک فاونڈیشن (رجسٹرڈ) ۱۔ ڈیوس روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۰ لاہور ۵۔ فون ۳۰۳۲۰۳ ۔ ۳۰۳۲۰۶

۲ سیّد رشید احمد اندرابی، ۲۱۔بی ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون : ۸۵۲۲۲۱

۳ مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ۔ لاہور

۴ میر عبدالقادر عبدالغنی اینڈ برادرز بہاولپور۔ فون : ۶۳۶۶

۵ محمد منشا ۱۵۸ بیت البدر عظیم روڈ۔ بہاولنگر۔

- اس دستاویز کی ایک کاپی پرویز میموریل ریسرچ سکالرز لائبریری میں رکھ دی گئی ہے :۔

اس کے علاوہ ہمیں محترم پرویز صاحب کے اصل مضمون "میکانکی اسلام" کی ابھی تلاش ہے۔ انشاءاللہ دستیابی پر اسے طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے گا۔

والسّلام

محمد عمر دراز

ثریّا عندلیب

قرآنِ حکیم اور اکیسویں صدی میں عورت کا کردار

قرآنک ریسرچ فاونڈیشن کے زیرِ اہتمام ہونے والے اس سیمینار کیلئے میرے مقالے کا عنوان ہے۔ قرآنِ حکیم اور اکیسویں صدی میں عورت کا کردار۔ اس مقالے میں قرآنِ حکیم کے آئینے میں عورت کے مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن نے عورت کو انسانیت کا وہی اعلیٰ مقام عطا کیا ہے جو مرد کو دیا ہے اور نوعِ انسان کی سربلندی کیلئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں۔ بالخصوص آنے والی اکیسویں صدی میں انسان کو تسخیرِ کائنات اور علوم و فنون کی ترویج کے حوالے سے بہت سی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ اس اعتبار سے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اکیسویں صدی کی ضروریات اور تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی ہمہ جہت اپنا کردار ادا نہ کرے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ عورت کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اتنے ہی مواقع اور ذرائع حاصل ہوں جتنے مرد کو آنے والی صدی میں حاصل ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں عورت اور مرد دونوں کو کام کرنے کے بھی مواقع اہلیّت و صلاحیت کی بنا پر یکساں مہیا کرنے ہونگے۔ لیکن عملی زندگی میں بھرپور کردار ادا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ عورت پر بحیثیت ماں جو بنیادی فرائض عاید ہوتے ہیں وہ انہیں نظر انداز کردے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کارزارِ حیات میں عورت کی بطور ماں ذمّہ داریوں اور بطور انسان اس کی صلاحیتوں کے استعمال کے حوالے سے اس پر عاید ہونے والی ذمّہ داریوں میں توازن قائم رہے۔ اس کے لئے لازماً معاشرے میں اس قسم کا نظامِ کار قائم کرنا ہوگا جس کے ماتحت عورت اپنے وقت کو مناسب طریقے سے بانٹ سکے اور وہ اپنی تمام ذمّہ داریوں کو بہ طریقِ احسن انجام دے سکے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ عورت کے مقامِ انسانیت کے بارے میں ہمیں کیا راہنمائی ملتی ہے۔ قرآن نے سب سے پہلے اس تصوّر کی تردید کی کہ خدا نے پہلے مرد (آدم) کو پیدا کیا تھا اور اس کی پسلی سے عورت (حوّا) کو نکالا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا) وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اور اس جرثومۂ حیات سے اس کا جوڑا بنایا۔) وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا

كَثِيرًا وَنِسَاءً (۴ : ۱) اور پھر ان دونوں خلیوں کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے مرد اور عورت میں پیدائش کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں۔ دونوں کا سرچشمہ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

عیسائیت کے چور دروازوں سے داخل شدہ یہ باطل عقیدہ ہم مسلمانوں میں بھی مروّج ہے کہ جنّت میں آدم کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی یعنی اماں حوّا نے شیطان کے چکمے میں آکر بابا آدم کو بہکایا۔ جب کہ قرآن نے صریحًا اس کی تردید کی ہے۔ اس کا فرمان ہے : فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا (۲/۳۵) یعنی شیطان نے ان دونوں کو بہکایا (هُمَا دونوں) اس لئے یہ سمجھنا یکسر غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمّہ دار عورت ہے اور مرد معصوم، یہ تو رہا منفی پہلو۔ مثبت پہلو دیکھئے شرفِ انسانیت کے بارے میں قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ :- وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷ : ۷۰) "اور بیشک ہم نے انسان کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ اس سے مراد صرف مرد نہیں، مرد عورت دونوں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مرد عورت دونوں کو بحیثیت انسان عزّت و احترام کا مستحق قرار دیا ہے۔ اسی طرح جب قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے انسان کو فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵ : ۴) پیدا کیا ہے۔ یعنی حسن کارانہ توازن کو لئے ہوئے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر ان میں توازن پیدا کیا جائے اور اس معاشرہ میں توازن پیدا کیا جائے جس میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے اور تیسری بات یہ کہ انسان اور کائنات کی قوتوں میں توازن پیدا کیا جائے۔ یعنی انسانی زندگی کا سارا مقصود توازن ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جب قرآن کی رُو سے انسانی زندگی مرد اور عورت دونوں کی زندگی ہے تو کیا یہ کسی صورت میں بھی ممکن ہے کہ یہ توازن صرف ایک صنف (تنہا مردوں یا عورتوں) کے ذریعے سے پیدا ہو سکے۔ کیا اس کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ الا لانسان کے آدھے حصّے کو یکسر نظر انداز کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانیت میں توازن پیدا ہو جائے گا ؟

قرآن کریم کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ انسان ہونے کی بنا پر دوسرے انسان کی عزّت کرے اور اسے ذلیل نہ سمجھے۔ اس اصول کے مطابق انسانوں کی آدھی صنف کے متعلق یہ فیصلہ کر دینا کہ وہ (محض حیاتیاتی (BIOLOGICAL) فرق کی بنا پر دوسری صنف کے برابر نہیں ہو سکتی قرآن کی بنیادی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں میں زندگی کے کسی گوشے میں کوئی تفریق نہیں رکھی۔ الّا ان فطری وظائف کے جو دونوں کے الگ الگ ہیں۔ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلّق ہے وہ دونوں کو یکساں طور پر ملی ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ لیکن مرد نے عورت کو ہزارہا سال سے ان مواقع و ذرائع سے محروم رکھا جس سے اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی اور پھر یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ عورت ناقص العقل

ہے۔ قرآن کریم اس کی تائید نہیں کرتا۔ اس کا موقف یہ ہے کہ مرد عورت دونوں کو یکساں مواقع دیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ دونوں کس طرح شاہراہ حیات پر شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی ۳۵ ویں آیت جلیلہ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ سے شروع ہو کر وَّاَجْرًا عَظِیْمًا پر ختم ہوتی ہے۔ مرد عورت کے برابر ہونے کا ایسا مستقل اور تابناک معیار ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ صلاحیت عطا کی گئی ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کر سکیں (اَلْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ) مرد عورت دونوں اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے امن عالم کی ذمہ دار بنتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) مردوں کو یہ صلاحیت ملی ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمال خدائی پروگرام کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں کو بھی عطا ہوئی ہے (وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ) اگر مرد اپنے دعوائے ایمان کو سچ کر دکھانے کے قابل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ) مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں نشوونما پاتی جائیں وہ قوانین خداوندی کے آگے اور زیادہ جھکتے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں کو بھی حاصل ہے۔ (وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) مرد عورت دونوں ایثار کرنے والے ہیں (وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) مرد عورت دونوں اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے وہ رک جائیں (وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ) اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی یہ پابندی کر سکتی ہیں۔ (وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ) مرد عورت دونوں قانون خداوندی کو سمجھنے اور اسے ہر وقت پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں (وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں یکساں طور پر موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لیے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظام خداوندی (اسلامی معاشرہ) میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجر عظیم موجود ہے (وَاَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (۳۳ : ۳۵)

دوسرے مقام پر مومن عورتوں کی خصوصیت سٰٓئِحٰتٍ بھی بتائی گئی ہے (۶۶ : ۵) یعنی سیاحت کرنے والیاں۔ اس موقع پر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ایک عظیم حدیث مبارکہ کے حوالے سے اسلامی معاشرہ کے ایک اہم ترین گوشے کی طرف توجہ دلانا چاہتی ہوں۔ جو قرآنی معاشرہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک ہاتھوں سے متشکل ہوا۔ حضورؐ نے اس کا منتہیٰ یہ فرمایا تھا کہ اس میں ایک عورت یمن سے شام تک تنہا سفر کرے گی اور اسے کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہوگا۔ اس فرمان نبوی سے یہ روشن حقیقت سامنے آتی ہے کہ حسن معاشرہ کی پہچان ہی یہ ہے کہ کیسی عورت گھر کے اندر ہو یا گھر سے باہر وہ کسی جگہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ پائے۔ قرآن حکیم نے

انسانی جان اور مملکت کو جتنا اہم قرار دیا ہے اسی قدر عورت کی حفاظت کو لازم ٹھہرایا ہے۔ اس مکمل ترین ضابطۂ حیات انسانی کے نزدیک جس معاشرہ میں کوئی عورت اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور نہ کرے اور اسے سماجی و اخلاقی لحاظ سے تحفظِ ذات اور عصمت حاصل نہ ہو۔ اس معاشرہ کا توازن قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ معاشرہ بگاڑ وفساد کی کھلی تصویر بن جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قانونِ خداوندی کے مطابق جناب رسالت مآب ؐ نے فرمایا ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی میدانوں صحراؤں میں سفر کر سکتی ہے اور تنہا بھی کر سکتی ہے مگر اسی صورت میں کہ مرد اپنی سوچ اور اپنے جذبات وخیالات کو احکامِ قرآنی کی چار دیواری میں رکھیں تاکہ عورت کو اپنی ذات وعصمت کی حفاظت کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ قرآن نے عورت کی ہستی کو فطرت کے پروگرام کا ایک اہم جزو بتایا اور یہ کہا ہے کہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور دونوں کا وجود فطرت کے نقشے میں اپنا اپنا مقام رکھتا ہے۔ مرد کی طرح عورت کو بھی اپنی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ جیسے علم حاصل کرنے کی صلاحیت اور تحصیلِ علم کا عمل تو وہ منفرد عمل ہے کہ جس کے بغیر شعورِ ذات ملتا ہے نہ آگہیٔ حیات ہو سکتی ہے۔ علم سے تہی دامن رہ کر ہم حیوانِ ناطق یعنی انسان درحقیقت سطحِ انسانیت تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ تعلیم کے بغیر نہ تربیتِ قلب وذہن ہو سکتی ہے نہ اپنی اگلی نسل کو یہ نعمتِ عظمیٰ منتقل کی جا سکتی ہے

ہم آپ جانتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ؐ پر اقرأ کی پہلی وحی نازل کی تو حضورؐ کی وساطت سے یہ ابدی حکم معاشرے کے تمام مردوں عورتوں کے لئے تھا اور خاتم النبیین ؐ کے بعد قیامت تک کے لئے تھا۔ اسی سے علم کی اہمیت واضح ہے۔ اس لئے حضورؐ نے تحصیلِ علم کو مرد عورت پر فرض قرار دیا ہے، خواہ اس کے لیئے وطن سے دُور بھی کیوں نہ جانا پڑے (چین جانے سے مراد یہی ہے) مگر قطع نظر ماضی کے ان زمانوں کے جن میں عورتوں پر علم کے دروازے کلیتاً مقفّل کر دیئے گئے۔ حال پر نظر ڈالتے ہوئے عورت کے آج کو دیکھئے اس بیسویں صدی کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی ہمارے ہاں ہمارے سماج میں کتنی عورتیں تعلیم یافتہ ملیں گی؟ تعلیم یافتہ ہونا (اور یاد رکھئے تعلیم میں دیگر تمام علوم کے ساتھ بنیادی تعلیم کتاب اللہ قرآن حکیم کو سمجھنے کی ہے) تو دُور کی بات ہے خواندہ یا حرف شناس خواتین کی تعداد کتنی ہوگی۔ بلاشبہ ہمارے شہر تعلیم یافتہ عورتوں سے خالی نہیں (اگرچہ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے لحاظ سے ان کی فیصد تعداد بھی بہت کم ہے) لیکن ایسے سینکڑوں ہزاروں دیہاتوں اور قصبوں کو نہ بھولئے جہاں کی ۹۵ فیصد عورت یا اس سے بھی زیادہ کو علم کی روشنی سے اس طرح دُور رکھا گیا ہے کہ وہ جانتی [illegible] کہ علم حاصل کرنا بھی کوئی ایسی شئے ہے جو ان کا بنیادی حق ہے ان کے کردار کا حصہ ہے اور جس سے محروم [illegible] کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ بے علم عورت کیا جان سکتی ہے کہ قرآنِ حکیم نے اسے سماج میں [illegible] اس نے معاشرے میں کیا کردار ادا کرنا ہے؟ اسے کیا خبر کہ مثلاً قرآن میں قانونِ وراثت

ے میں کیا کہا گیا ہے قرآن کے آئینے میں وہ دیکھ سکے تو اسے معلوم ہو کہ ورثہ کا مالک صرف مردوں کو ہی ں بنایا گیا عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں اور ان کے اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا۔

ورثہ کی وصیت یا تقسیم مختلف رشتوں کے تحت ضرورت کی کمی بیشی کے مطابق مساوات اور انصاف کی رُو سے تی ہے اور اس میں مرد کے مقابلے میں جو کمی ایک پہلو سے عورت کیلئے نظر آتی ہے وہ دوسری طرف سے عورت کے بارے میں پوری بھی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے کی آیات اس کی شاہد ہیں۔

وراثت کے بعد قانون شہادت یعنی گواہی کو لیجیئے جو سماجی و معاشرتی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اسی لئے قرآن کریم نے سچّی گواہی دینے کا حق مرد عورت دونوں کو دیا ہے۔ دیگر حقوق کی طرح یہ بھی ایک مساوی حق ہے۔ اس میں نہ تو مرد کی برتری کا کوئی جواز نکلتا ہے نہ ہی عورت کی کمتری کی کوئی بات چھپی ہے۔ ایک سیدھی اور صاف بات ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل نہیں چاہیئے۔ لیکن مطلب مدّعا اگر مرد کی مصنوعی برتری ہی ہو تو سینکڑوں حیلے ہزاروں تاویلیں نکالتے چلے جائیے لازماً دو عورتیں برابر ہو جائیں گی ایک مرد کے۔ ہاں مگر جب آپ قرآن کی روشنی میں آئیں گے تو آپ دیکھ سکیں گے کہ اللہ تعالے نے یہ کہیں نہیں کہا کہ گواہی کیلئے دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی لی جائے۔ سورۃ البقرہ کی ۲۸۲ ویں آیت میں بتایا یہ گیا ہے کہ گواہی ایک ہی عورت نے دینی ہے لیکن، دوسری عورت اس کی جاننے والی اس کے ساتھ اس لئے کھڑی ہوگی کہ اگر گواہ عورت کسی بات پر گھبرا جائے یا اسے کوئی الجھاؤ پیدا ہو تو دوسری اسے یاد دلا دے کہ صحیح بات کیا ہے۔ گواہی صرف گواہ عورت یعنی ایک ہی کی لی جائے گی۔ قرآن کریم میں یہ نہیں ہے کہ ایک عورت کے بعد دوسری عورت کی گواہی بھی لی جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کو کوئی گھبراہٹ نہ ہو وہ کہیں کنفیوز نہ ہو تو دوسری عورت کو ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی شہادت کا ذکر آیا ہے کسی جگہ بھی جنس کی تخصیص نہیں کی گئی کہ مثلاً چار گواہ (جرم فحش کے ضمن میں) صرف مرد ہوں ان میں عورت کوئی نہ ہو۔ یا اگر تین مرد ہوں تو چوتھے مرد کی بجائے دو عورتیں گواہ ہوں۔ کسی جگہ بھی ایسا نہیں کہا۔ نہ ہی یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ اگر مرد گواہ نہ ہوں صرف عورتیں ہی گواہ ہوں تو مقدمہ خارج اور ملزم کو بری قرار دیا جائے۔ کیونکہ مردوں کی عدالت میں عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔

گواہی تو پھر گواہی ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہاں مقتولہ عورت کی دیت مردوں سے آدھی قرار پائے یعنی عورت کی جان کی قیمت مرد کی جان کی قیمت سے نصف ہو۔ وہاں عورتوں کے حقوق کی کیا بات ہو سکتی ہے اور وہ اپنا کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟ تاہم اگر ہم اپنے مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں تو ہمیں راہنمائی قرآنِ حکیم سے ہی لینا گی۔ عائلی زندگی میں قرآن نے اکتساب رزق کی ذمّہ داری مرد پر رکھی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اہل و

عیال کی ضروریات کو پورا کرے۔ جب کہ عورتوں کو اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق رزقِ حلال کما سکنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور انہیں اس کمائی کا مالک بھی ٹھہرا گیا ہے۔ (۴ : ۳۲) قرآنِ کریم عورت کو مرد کا معاشی محتاج نہیں بنانا چاہتا اس لئے وہ اپنے طور پر اکتسابِ رزق کا کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں میاں (مرد) کو جو بیوی بچوں کی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت مرد کی محکوم و محتاج ہو جاتی ہے۔ قرآن نے تو تقسیم کار کے اصولوں پر مردوں کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وہ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ ہیں (۴/۳۴)۔ لیکن ہماری ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی آیت کو حسبِ منشاء معانی پہنا کر مرد کی حاکمیت کا جواز نکالا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "مرد عورتوں کے سربراہ یا داروغہ یا حاکم ہیں" اور اسی سے عورتوں کو مردوں سے پست قرار دینے کا نظریہ قائم کیا گیا۔ ایک طرف یہ ترجمہ دیکھئے اور دوسری طرف قرآنِ کریم کی اس ساری تعلیم کو سامنے لائیے جو اس نے عورتوں اور مردوں کے سلسلہ میں دی ہے۔ اور پھر غور کیجئے کہ اس آیت کا مذکورہ ترجمہ کسی طرح بھی اس تعلیم سے مطابقت رکھتا ہے؟ قرآن نے تو واشگاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ دیدے کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کے علاوہ میرے محکوم بن جاؤ (سورۃ آلِ عمران کی ۷۸ ویں آیت)

کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ جو قرآن کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے کیا وہ یہ اصول بیان کرے گا کہ انسانوں کی آدھی آبادی (مردوں) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ دوسری نصف آبادی (عورتوں) پر حاکم اور داروغہ بن کر بیٹھ جائے؟ اور اس محکوم طبقہ کی حالت یہ ہو کہ وہ اس محکومیت کے شکنجے سے کبھی نکل ہی نہ سکے۔ اس لئے کہ جب عورت ہونا اسے مرد کا محکوم بنا دے گا تو وہ اس کی حاکمیت کے آہنی پنجے سے پیدائش سے لے کر موت تک کبھی نکل سکے گی؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ قرآن کا نازل کرنے والا اللہ اسی قسم کی تعلیم دے گا؟

اب آئیے لفظ قوّام کی طرف۔ قدیم اور مستند عربی لغت تاج العروس کی رُو سے قوام کا مادہ ہے۔ ق۔ و۔ م اور قوّام کا مطلب ہے۔ عدل و توازن، وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے۔ اس اعتبار سے قوّام کے معنی بتائے گئے ہیں: سامانِ رزق مہیا کرنے والا کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے اب اس آیت کا مفہوم واضح ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ عورتیں اپنے بعض خصوصی فرائض یعنی بچوں کی پیدائش، پرورش اور تربیت کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتسابِ رزق کے لئے سارا وقت نہیں دے سکتیں جب کہ روزی کی ہمہ وقت ضرورت ہوتی ہے مگر یاد رہے یہ تو خاندانی زندگی کا ایک عمومی نقشہ ہے ورنہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک

ت وہ سب کچھ کر سکنے کی اہل ہے جو مرد کر سکتے ہیں نہ ہی یہ قوامیت عورت کے کسب معاش میں خلل انداز ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے زندگی کا کوئی گوشہ اور معاملہ ایسا نہیں جہاں انسانیت اور معاشرت کے تعلق سے معیشت و سیاست کے حوالے سے اور اخلاق و اقدار کے اعتبار سے عورت کو وہ مقام نہ مِلا ہو جو مرد کو ملا ہے نیز عورت وہ کردار نہ ادا کر سکتی ہو جو مرد کر سکتا ہے۔

میاں بیوی کی حیثیت میں قانونی نقطۂ نگاہ سے بھی قرآن نے عورت کا مقام واضح کر دیا ہے یہ کہہ کر وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸ : ۲) یعنی قاعدے اور قانون کے لحاظ سے عورتوں کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، اتنے ہی ان کے حقوق ہیں۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے یہ ایک ایسا اصول بیان کیا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے جہاں تک امورِ مملکت میں مرد عورت کے مساوی حصّہ لینے کا تعلق ہے تو اس کیلئے سورہ حج کی طرف آیئے جہاں اُمّتِ مسلمہ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے (جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کی پیروی کرتے چلے جائیں) اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے (یعنی افرادِ معاشرہ کو پھلنے پھولنے کا سامان مہیّا کریں گے ـــ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے (۴۱ : ۲۲) یعنی یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس فریضہ کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیا ہے یا اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ سورۃ توبہ میں ارشادِ ربّی ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷۱ : ۹)

یعنی مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں یہ (مرد اور عورتیں) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ (معروف کام وہ ہیں جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور منکر وہ کام جنہیں قرآن جائز قرار نہیں دیتا) اس فرمانِ خداوندی سے ظاہر ہے کہ امورِ مملکت میں بھی مرد کی طرح عورت اپنا کردار انجام دے سکتی ہے اور اس میں دونوں برابر کی سطح پر شریک ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک جامع اصول ہے اور مملکت کے حوالے سے جو بھی ذمّہ داریاں اور انتظامی شعبے ہوں گے ان کو اس مستقل اصول کے تحت مردوں اور عورتوں میں ان کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کرنا ہوگا اور اس میں سربراہی سے لے کر آج کی زبان میں کلرکی تک ساری ذمّہ داریاں اور متعلقہ امور آجاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس میں مرد عورت کی کوئی تفریق نہیں رکھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی آیاتِ بیّنات واضح طور پر عورت کے مقامِ انسانیت اور کردار

حیات پر روشنی ڈالتی ہیں اس دائمی روشنی اور مستقل راہنمائی کی موجودگی میں عورت کا آنے والی اکیسویں صدی میں ک
متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مشکل صرف یہ ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں کے مردانہ معاشرہ کے ہاتھوں عورت کو جن جانگسل
اور ذلت آمیز حالات سے گزرنا پڑا اور مرد کی محکومیت اور غلامی کی زنجیروں نے جس طرح اُسے باندھے رکھا اُ
نے خود اس کو اپنی ہی نظروں میں اپنے مقام سے گرادیا۔ اسے اس طرح احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا گیا کہ اس
مرد کی خودساختہ برتری کے مفروضہ کو بظاہر دل وجان سے قبول کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھ لی اور اس کی زندگ
بے زبان جانور کی طرح گزرنے لگی۔ مرد کی اجارہ داری سے عورت کے انسانی حقوق پامال ہوتے رہے اور وہ اس ظلم
کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی مجاز نہ ہوئی۔

عورت کی مظلومی اور بے بسی کی داستان خونچکاں زمانوں پر محیط بڑی طویل ہے جسے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ تاہم ہم اس سنگین حقیقت سے آنکھیں چرا نہیں سکتے کہ آج اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں بھی جب کہ انسان خلاؤں اور آسمانی کروں تک پہنچ چکا ہے اور ہر طرف انسانی آزادی کے بلند بانگ نعرے گونج رہے ہیں۔ عورت کی اکثریت (بہت بڑی) دورِ جاہلیت و دورِ ملوکیت کی پیدا کردہ غلامی و محتاجی کی اسیر ہے اور مجموعی طور پر مرد کی زیردست رہ کر زندگی گزارنے پر مجبور۔ یہی وجہ ہے کہ مرد کی دنیا میں عورت کی محنت و مشقت اور کارکردگی کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ معاشی و معاشرتی اور خانگی امور میں وہ جو کردار انجام دیتی ہے اسے پس پردہ کردیا جاتا ہے۔ یہ سب موانعات اور ایسی طرح طرح کی مشکلات راستے میں حائل ہونے کے باوجود موجودہ دور میں عورت کی بیداریٔ شعور اور احساسِ عزتِ نفس نے اسے اپنے کردار کی ادائیگی سے پہلے کی طرح بے خبر لاعلم اور غافل نہیں رہنے دیا۔ اگرچہ اپنے ہاں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ایسی تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور پاکستان کے بعض علاقوں میں تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور یہ اس لئے کہ ان پر علم کے دروازے بند رکھے گئے۔ اس بندش کے ہوتے ہوئے بھی آج کی پاکستانی عورت نہ صرف گھر کی ذمہ داریاں نبھاتی ہے بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں اپنا کردار ادا کررہی ہے۔ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور وکیل بھی۔ وہ انجینئر ہے، پائیلٹ ہے آرکیٹیکٹ ہے، آرٹسٹ ہے۔ استاد ہے، ادیب ہے، شاعر ہے، مبلغ ہے، مصنف ہے صحافی ہے۔ سول سروس میں ہے۔ عورتیں کارخانوں میں بھی کام کرتی ہیں، دفتروں میں فرائض پورے کرتی ہیں، بینکوں کے انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ غرض کہ ان تمام اعمال و امور سے عورت نے ثابت کیا ہے کہ وہ ان تمام شعبہ ہائے حیات میں کام کرسکتی ہے جن کو مرد نے صرف اپنے لئے مخصوص سمجھ رکھا تھا۔ مرد پھر بھی تجاہل سے کام لیتا ہے اور اسے عورت کی یہ بیداری و آگہی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

ایک طرف تعلیم یافتہ عورتیں اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ایسی ذمہ داریاں انجام دے رہی ہیں۔ دوسری

...کارکن اور محنت کش عورتیں ہیں جو بالکل ناخواندہ ہیں۔ مگر بال بچّوں کی خاطر روزی کمانے کے لئے ہر طرح کا بوجھ ... رہی ہیں۔ یہ ننانوے فیصد عورتیں دن رات کئی کئی مردوں کے برابر کام کرتی ہیں مگر اتنی محنت مشقت کے باوجود ... آدھی کہلاتی ہیں۔ کئی کئی میل سفر کرکے پانی لاتی ہوئی پہاڑی عورتیں اور سولہ سولہ اینٹیں سر پر رکھتے کئی کئی منزل ...وں پر لے جانے والی عورتیں۔ سڑک پر پتھر کوٹتی تپتی دوپہر میں جلتی عورتیں اور اپنے گھروں میں خاتونِ خانہ کا ...دار ادا کرنے والی صبح ۵ بجے سے لے کر رات گئے تک محنت کرتی عورتیں معاشرے کے حوالے سے جو ... ادا کر رہی ہیں اس کی اہمیت و افادیت سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر معاشرے میں عورت اپنا کردار ادا نہ کرے اور کام کرنا بند کردے تو دنیا کے آدھے کام ...ک جائیں۔ شہری اور کارکن عورت کے شب و روز کا جائزہ لیا جائے تو چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں سے اٹھارہ ۱۸ گھنٹے ...ں عورت کو گھر اور دفتر کے کام کرنا ہوتے ہیں۔ بہت سی استانیوں، سوشل ورکروں اور لیڈی ہیلتھ وزیٹروں کو شہر سے دیہات چل کر نوکری کے لئے جانا ہوتا ہے۔ سفر کیلئے چار گھنٹے کارکردگی کے مصروف گھنٹوں کے علاوہ ہیں۔ ...س سب کے باوجود دنیا بھر میں مختانہ حاصل کرنے والی قوت میں عورتوں کی تعداد سب سے کم ہے۔ پھر جو عورتیں کام کرتی ہیں ان کو غیر اجرتی رکھنے کی شعوری اور لاشعوری کوشش کی جاتی ہے۔ پاکستان میں دیہی عورت کی کارکردگی کو معیشت میں حصّہ داری کی سطح پر لینے کا کوئی رواج نہیں شہری عورت بھی کام کرکے اکثر و بیشتر پوری تنخواہ لاکر شوہر کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے اس زراعت کے دو پہیے عورت اور مرد دونوں مل کر بنتے ہیں۔ چنانچہ عورت مرد کے ساتھ مل کر کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ فصل کی کٹائی چھڑائی، بٹائی اور گھر میں چارہ کاٹنے سے لے کر دودھ دوہنے جانوروں کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ گھر کے کام کاج عورت کرتی ہے مگر اس کا نام کماؤ فرد کے طور پر کہیں بھی نہیں لیا جاتا، نہ دیہات میں نہ شہر میں۔ یوں عورت اپنا مکمّل کردار ادا کرتے ہوئے بھی معیشت و معاشرت میں اپنا مقام نہیں پاتی۔ جب کہ پاکستان کی ۹۵ فیصد عورت محنت کش ہے اور گھر کی معیشت اور معاشرت چلانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا کردار مرد کے برابر بلکہ بعض صورتوں میں مرد سے زیادہ ہے۔ باوصف اس کے وہ پس ماندہ کہلاتی ہے۔ درحقیقت پس ماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم سے محرومی ہے جس سے اگرچہ کم و بیش پاکستان کے مرد عورت دونوں دوچار ہیں لیکن مردانہ معاشرہ ہونے اور بحیثیت مجموعی مرد کا عورت پر غلبہ و تسلّط رہنے کے سبب پس ماندگی کا الزام بھی عورت ہی کے سر دھر اجاتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کے نقصانات بھی عورت ہی کو بھگتنا ہوتے ہیں۔ ایسے تمام مسائل و موانع نے بیسویں صدی کے اواخر میں بھی بالخصوص مسلمان پاکستانی عورت کو گھیر رکھا ہے ان کے باعث وہ نشو و ارتقاء کی راہ میں منزلوں پیچھے رہ گئی ہے بلکہ رکھی گئی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں

کہ اس صورتِ حال سے چھٹکارا حاصل کئے بغیر بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے عورت اپنا کردار متعین کر سکتی ہے نہ انجام دے سکتی ہے۔

اس لئے آج سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت پوری سنجیدگی کے ساتھ معاشرے کی نصف آبادی عورتوں کی مکمل تعلیم کا نہایت معقول انتظام کیا جائے جو رائج الوقت علوم وفنون پر محیط ہو۔ نیز اس بات کو افراد کی مرضی پر نہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں بلکہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے علم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے حکومتی سطح پر قانوناً لازم قرار دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ مرد بھی تعلیم سے بیگانہ رہیں نہ رکھے جائیں کیونکہ اس کا نتیجہ مرد عورت دونوں کے لئے نقصان رساں ہوتا ہے۔ خاص طور پر مرد کی جہالت ہی ہمارے ہاں عورت کے حصولِ تعلیم میں بھی سدِ راہ بنتی ہے اور اگر وہ تعلیم حاصل کر لے تو اسے ثمر آور نہیں ہونے دیتی۔ جب جہالت اور تعلیم کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو مرد عورت کی رفاقت پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور ایک طرف گھریلو زندگی انتشار و خلفشار کا شکار ہوتی ہے تو دوسری طرف معاشرے کا امن وسکون برباد ہو جاتا ہے افرادِ معاشرہ پر ترقی و سربلندی کی راہیں کھُل نہیں پاتیں۔ یوں یہ بات طے شدہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر جہالت پر عاید ہوتی ہے جس کو تعلیم کی مناسب ضرب سے ہی مٹایا جا سکتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ علم سائنس کی تحصیل و ترویج میں بتدریج اب تک جس قدر ترقی ہوئی ہے اور نوعِ انسان سائنسی ایجادات سے جس طرح فائدہ اٹھا رہی ہے اور تسخیرِ کائنات کی طرف مسلسل قدم بڑھا رہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ یقینی امر ہے کہ اکیسویں صدی کا اوجِ کمال کو پہنچنے والا سائنسی اور کمپیوٹرائزم کا دور کسی قسم کی جہالت قبول کرنے یا اس سے واسطہ رکھنے پر تیار نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ آنے والے ادوار میں انسان نے قانونِ قدرت کے مطابق بہت آگے بڑھنا ہے اور تسخیرِ کائنات کی کاوشوں میں اضافہ کرنا ہے۔ کیونکہ قرآن کے فرمان کے مطابق انسان پر تسخیرِ کائنات کا فریضہ عاید ہوتا ہے اور چونکہ انسان مرد عورت دونوں کا نام ہے۔ اس لئے اس اہم گوشے کی طرف بھی مرد عورت دونوں کو توجہ دینا ہوگی۔ انسانی ذہن کی بیداری کا مطالبہ یہی ہے کہ عورت مرد کے ساتھ شامل رہ کر اس فریضۂ خداوندی کی تکمیل کے لئے بہ حدِ ممکن استعداد پیدا کرے اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دے۔

تعلیم کے حوالے سے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تعلیم کا مقصد ذہنی تربیت، ذہنی بیداری اور آگہی شعورِ ذات ہوتا ہے۔ صرف کتاب پڑھنا یا دستخط کر لینا نہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ غور ہونا چاہیے کہ ترقی پذیر اور زرعی ممالک میں (جن میں پاکستان بھی شامل ہے) تعلیم کا انداز اور اس کا نقطۂ نظر کیسا ہو؟ اگر لفظی طور

... کی بجائے تربیتی اور خود احتسابی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ زیادہ فائدہ مند نتائج کا حامل ہو سکتا ہے ... علم اور تحصیل علم کے سرچشمے زیادہ وسعت حاصل کر سکتے ہیں۔ جن سے ۲۱ ویں صدی کے تقاضے ... پورے ہو سکیں گے۔

... ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس نعمت عظمیٰ کے حصول کی خاطر ہر دور میں ہر خطۂ ارض پر انسان کی تگ و دو ... رہی ہے۔ ضابطۂ انسانیت قرآن کریم کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کی ... پیر میں بیڑی ڈال کر اسے اپنا غلام یا محکوم بنا لے۔ اس فیصلۂ خداوندی کے باوجود آغاز انسانیت سے لے کر اب تک انسان ... انسان کی غلامی کے چنگل سے کلیتاً آزاد نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ غلامی اور محکومی بدستور موجود ہے۔ جیسے عورت جو دور جاہلیت میں تو مرد کی محکوم اور لونڈی سمجھی ہی جاتی رہی لیکن وہ آج بھی علم و عرفان کے روشن زمانے میں بھی ... محکوم ہے اور یہ حقیقت مستور کر دی گئی ہے کہ مسلمان عورت ہی دنیا بھر میں وہ پہلی عورت ہے جو آزادی سے ہمکنار ہوئی۔ قرآن کریم کے نزول سے شکنجوں میں جکڑی ہوئی عورت کو حقیقی آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔ حیات انسانی آزادی فکر و عمل کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس مستقل اصول کے تحت آنے والا دور اپنے ارتقائی تقاضے پورے نہیں کر سکے گا۔ جب تک انسانی آزادی مرد عورت دونوں سے متعلق نہ ہوگی۔ چنانچہ ۲۱ویں صدی میں عورت کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کیلئے لامحالہ آزادئ فکر و سوچ کی راہ پر چلنا ہوگا۔

مسلمان عورت کی آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باورچی خانے اور بال بچوں کی ضروریات کی خریداری کے لئے بازار میں گھوم پھر سکے یا بلا روک ٹوک ادھر اُدھر آ، جا سکے۔ آزادی سے مراد یہ ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکے۔ اپنے خاندانی معاملات میں اپنے اختیار و ارادے سے صائب رائے دے سکے اور اپنے ملک کی سیاسی معاشی اور سماجی زندگی میں شریک کار رہ کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی رہے۔

عورت کا کردار اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ وہ جارحیت کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو کیونکہ وہ وصف انسانی ہے جس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، جو شخصیت کی تعمیر میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس صلاحیت کی نشوونما کیلئے عسکری قسم کی تربیت کا عورتوں کیلئے انتظام ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ آپ اپنی حفاظت کر سکیں اور معاشرہ کی منفی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

عورت کا کردار بطور "ماں" بڑا ہی اہم ہے۔ جس سے کسی زمانے کسی دور اور کسی صدی میں بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آنے والی نسل 'ماں' ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے اور 'ماں' ہی بچے کی بہترین تربیت کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

علماء نفسیات کی تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ بچے نے بڑی عمر میں جا کر جو اخلاق و کردار اختیار کرنا ہوتا ہے

اس کی بنیاد ماں کی آغوش میں پڑجاتی ہے۔ بعد کی تعلیم تو اس عمارت کو پختہ کرتی ہے۔ اس ضمن میں کسی دانشور کا قول ہے کہ "مجھے پڑھی لکھی مائیں دو اور میں تمہیں شائستہ اور ترقی یافتہ معاشرہ دوں گا"۔ چنانچہ عورت کا کردارِ امومت بھی ۲۱ ویں صدی کا ایک لازمی حصہ ہوگا۔ اس کردار کے ساتھ تعلیم و تربیت یافتہ مائیں بچوں کو انسانیت ساز تربیت دینے کی صورت میں معاشرہ کو بہترین افراد مہیا کرسکیں گی۔ لیکن ایسا خوشگوار مستقبل حال کو بے حال چھوڑے رکھنے سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لئے ہمیں ابھی سے اہم اقدامات کرنا ہوں گے۔ اس میں ہر لڑکی اور ہر عورت کیلئے حصولِ تعلیم کا معقول اور مستقل انتظام سرِفہرست آتا ہے کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ماں بچوں پر اپنی ممتا تو لٹا سکتی ہے لیکن ان کی ذہنی تربیت نہیں کرسکتی۔ دوسری اہم بات ملازمت پیشہ ماؤں کو ایسی سہولت بہم پہنچانا ہے کہ انہیں صبح سے شام تک مسلسل سات آٹھ گھنٹے گھر سے باہر ڈیوٹی نہ دینا پڑے کہ جس سے بچوں کی دیکھ بھال میں بڑا خلل پڑتا ہے۔ اس کی جگہ معاشرے میں ایسا سسٹم (نظامِ کار) رائج کیا جائے کہ جس کے تحت پارٹ ٹائم جاب (JOB) جو ۲ یا ۳ گھنٹوں کا ہو۔ ان کے لئے رکھا جائے تاکہ وقت کی صحیح تقسیم کے اصول کے مطابق وہ عورت جو ماں ہے بچوں سے متعلق اپنے فرائض بھی بہ حسن و خوبی ادا کرسکے اور اپنی ذاتی و ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر معاشرہ کی ترقی میں بھی حصہ لے سکے۔ اسی متوازن کردار سے معاشرہ میں بحیثیت مجموعی حسن و توازن برقرار رہتا اور معاشرہ فروغ پاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسانی کردار کا زندگی کے مختلف شعبوں میں عمل دخل ہوتا ہے۔ معیشت ہو یا معاشرت یا سیاست ہر جگہ انسان یعنی مرد و عورت کا کردار بروئے کار آتا ہے۔ سیاست کے گوشے کو دیکھئے، اس میں جمہوریت کی جو اہمیت اور افادیت ہے اس سے باشعور شہری اور عوام اچھی طرح واقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوریت کی بنیاد فردِ معاشرہ کا حقِ رائے دہی یعنی اپنی صوابدید کے مطابق ووٹ دینا ہے، جس کا حق ہر بالغ و عاقل فرد رکھتا ہے۔ یہ ایک انسانی حق ہے۔ اس لئے اس میں مرد عورت کی تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر ہمارے ہاں آج کے جمہوری دور میں بھی اس حق سے عورت کو محروم رکھنے کا رواج موجود ہے خاص طور پر ہماری دیہی عورتوں کی اکثریت اس حق کو استعمال کرنے کی مجاز نہیں ہوتی۔ نتیجتہً اس قسم کی غیر منصفانہ پابندیوں کے زیرِ اثر رہنے والی خواتین کا کردار متحرک اور فعال رہنے کی بجائے منجمد اور بے جان ہوجاتا ہے۔ جمود موت کا دوسرا نام ہے۔ عورت کو ایسے منجمد یا مردہ کردار سے وابستہ کرنا اور رکھنا صریحاً انسانیت کی تذلیل ہے جس کا متحمل آنے والا ارتقائی دور نہیں ہوسکتا۔

عورت کے حوالے سے اب تک جو ہوچکا وہ تو ہوچکا لیکن اب سمجھنے والی بات یہ ہے کہ آئندہ صدی میں ارتقائی منازل کی مناسبت سے معاشی و معاشرتی، سیاسی و سائنسی مطالبات کیا ہوں گے اور ہمیں بطور انسان کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ایک جملے میں اس کا ملخص یوں سمجھئے کہ انسانیت کی

بقا اور زندگی کی نشوونما کا انحصار بلاشک وشبہ مرد کے ساتھ شامل عورت کے زندہ کردار پر ہے۔ لہٰذا ارتقاء کی جانب بڑھتے رہنے کیلئے ہمیں لازماً مرد و عورت کے مشترکہ کردار سے کام لینا ہوگا۔ وہ کردار جو خلوص و دیانت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ تمام شعبہ ہائے حیات میں عمل پیرا رہے گا۔

اکیسویں صدی کے آغاز کو صرف دس سال باقی ہیں۔ آئیے! اس کے استقبال کیلئے قدم بڑھائیں اس عزم کے ساتھ کہ ہم نے انسانیت کے مستقبل کے اس حسین خواب کو حقیقت میں بدلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت ہمارے شاملِ حال رہے۔ آمین!

خلاصہ

اس مقالے میں قرآنِ حکیم کے آئینے میں عورت کے مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نوعِ انسان کے ارتقاء کے عمل میں عورت کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن نے عورت کو انسانیت کا وہی اعلیٰ مقام عطا کیا ہے جو مرد کو دیا ہے اور نوعِ انسان کی سربلندی کیلئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت دونوں کارزارِ حیات میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں بالخصوص آنے والی اکیسویں صدی میں انسان کو تسخیرِ کائنات اور علوم و فنون کی ترویج کے حوالے سے بہت سی ارتقائی منازل طے کرنا ہیں اس اعتبار سے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ۲۱ ویں صدی کی ضروریات اور تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک مرد کے شانہ بشانہ عورت بھی ہمہ جہت اپنا کردار ادا نہ کرے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ عورت کو تعلیم و تربیت کے حصول اور صلاحیتوں کی نشوونما کے اتنے ہی مواقع حاصل ہوں جتنے مرد کو حاصل ہونگے نہ صرف یہ بلکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں عورت اور مرد دونوں کو اپنی اہلیت کی بنا پر کام کرنے کے مواقع بھی یکساں مہیا کرنے ہونگے لیکن عملی زندگی میں بھرپور کردار ادا کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بطور ماں عورت پر جو عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اسے نظر انداز کردے دیکھنا یہ ہوگا کہ بحیثیت ماں اس کی ذمہ داریوں اور بطور انسان اس کی صلاحیتوں کے استعمال کے حوالے سے عاید ہونے والی ذمہ داریوں میں کوئی تصادم نہ ہو بلکہ دونوں کے درمیان ایک توازن قائم رہے۔ اس کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ معاشرے میں اس قسم کا نظام قائم کیا جائے جس کے تحت عورت اپنے وقت کو فرائضِ زندگی کی ادائیگی میں مناسب طریقے سے بانٹ سکے اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن انجام دے سکے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے مطابق عورت سے اکیسویں صدی کا یہی مطالبہ ہے۔

حوالہ جات:- (۱) مفہوم القرآن (۲) اسلام کیا ہے : ــــــ از علامہ غلام احمد پرویز رح

(۳) عورت خواب اور خاک کے درمیان : ــــــ از کشور ناہید

تین چونکا دینے والی کتابیں

قرآنی انقلاب کیسے آئے گا؟

مصنف: قاسم نوری
کمپیوٹر سے کمپوزنگ
کتابت: نفیس رقم
سفید عمدہ کاغذ
قیمت: ۵۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

- اللہ کا دعویٰ ہے کہ اس کرۂ ارض پر دینِ اسلام غالب رہیگا۔ مگر کیسے؟
- یہ دنیا سراپا جنت بنے گی۔ مگر کب، کن ہاتھوں سے اور کس طرح؟
- ہر شخص قرآن کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن ہم اپنی مومنانہ عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کیسے کریں؟
- وہ انقلاب محمدؐ کیا تھا جس نے انسانی تاریخ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔؟
- آپ بھی خوبصورت بن سکتے ہیں اور کبھی بیمار بھی نہیں ہو سکتے آبِ حیات کا راز کھلتا ہے۔

رونا چھوڑیئے جینا شروع کیجئے

از: محترمہ جان فردوس
کمپیوٹر سے کمپوزنگ
سفید عمدہ کاغذ
قیمت ۵۰ روپے (ڈاک خرچ علاوہ)

- تمام انسانوں کا تخلیق کرنیوالا اللہ ہے لیکن تخلیق کا ذریعہ صرف عورت ہوتی ہے
- مرد آدھا انسان ہے عورت اسے پیدا بھی کرتی ہے اور اس کی تکمیل بھی کرتی ہے
- مرد نہ برتر ہیں نہ عورتوں پر حاکم نہ داروغہ
- عورت کی توہین۔ اللہ رسول اور پوری انسانیت کی توہین ہے۔
- عورت کیا تھی اور کیا بنا دی گئی
- انقلاب پیدا کر دینے والی کتاب جسے ہر لڑکی کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

غلام احمد پرویز (جامع تعارف)

از ــــــــ قاسم نوری
تعارف محمد لطیف چوہدری (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)
کمپیوٹر سے کمپوزنگ، سفید عمدہ کاغذ
قیمت ۵۰ روپے (ڈاک خرچ علاوہ)

- ایسے تاریخی حقائق کا انکشاف جو پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے
- یہ کتاب ایسا آئینہ ہے جس میں علامہ پرویز صاحب کی شخصیت کی جھلک اور ان کے علمی دینی افکار کے خدوخال بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ: عروج اکیڈمی نزد جیرز میری سکول۔ پنڈی پوائنٹ مری۔

حرفِ اوّل

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے نومنتخب نمائندہ محمد علی بیگ صاحب کا اراکینِ بزم سے پہلا خطاب

صاحبو! میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک بہت ہی عظیم ذمہ داری سونپ کر میری عزت افزائی فرمائی ہے۔ دراصل آپ نے میرے نحیف کاندھوں پر میری طاقت سے بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ جسے میں آپ کی دعاؤں اور عملی تعاون کے بغیر شاید نہیں اٹھا سکوں گا۔

میرے اس اندازِ ممنونیت پر کچھ قرآنی احباب کے ہونٹوں پر خندۂ استہزار کے پھول کھل اٹھے ہونگے کہ یہ کتنا بڑا عہدہ ملنے پر اس قدر تکلف سے اظہارِ شکر گذاری اور عجز و انکساری پیش کیا جا رہا ہے۔ خندہ زن احباب شاید نہیں جانتے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کن عظمتوں کی مالک ہے۔ یاد دلاتا چلوں کہ بزمِ طلوعِ اسلام وہ عظیم بزم ہے کہ چودہ صدیاں قبل جس کی بنیاد خود رسول اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ جس کے اراکین رسولِ اکرمؐ کے صحابہ عظام تھے۔ اس بزم کے صدر خود رسولِ اکرمؐ تھے۔ وہ دَور انسانی جدوجہد کا اور عملی تگ و تاز کا کتنا سنہری اور دل آویز دَور تھا۔ اس بزم میں تربیت پا کر ابوبکر سے صدیق۔ عمر سے فاروق۔ عثمان سے غنی اور علی سے حیدرِ کرار بن گئے تھے۔ اور ان اراکین نے پھر کہنے سننے، سوچنے سمجھنے۔ لکھنے اور پڑھنے کے انداز بدل ڈالے تھے۔ اور انسانیت کی ایک نئی تاریخ رقم ڈالی تھی۔ اس پہلی بزمِ طلوعِ اسلام کے اراکین کو اس حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے پاس کام بہت زیادہ ہے لیکن وقت بہت کم ہے۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یوں نکالا کہ بزم کے اجلاس روزانہ کرنے لگ گئے۔ وہ ایک ایک دن میں پانچ پانچ اجلاس منعقد کرنے لگے۔ ان کا آخری اجلاس عشاء کی نماز کے بعد گئے رات تک جاری رہتا۔ دین سیاست، معاشرت اور معیشت کے مسائل پر گہرا غور و خوض کیا جاتا۔ ان عظیم اور اہم ذمہ داریوں کے پیشِ نظر وہ اراکین، کھانا، پینا۔ سونا اور آرام کرنا تک بھول گئے تھے۔ وہ ہمہ وقت دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل کے حل کیلئے مصروفِ عمل رہتے تھے۔ چونکہ انہوں نے

(۱) عالمِ انسانیت کو قرآنی افکار سے روشناس کرنا تھا (۲) دنیا کو اسلامی اقدار سے متعارف کرنا تھا (۳) اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالنی تھی (۴) ملّتِ اسلامیہ کی تعمیر کرنی تھی (۵) دین اسلام کو نافذ کرنا تھا (۶) اسلامی سیاست کا قیام عمل میں لانا تھا جس میں حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہوتا ہے (۷) اسلامی معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں ظلم نہیں عدل ہوا کرتا ہے۔ (۸) اسلامی نظامِ معیشت قائم کرنا تھا

جس میں انسان تو کجا کتے بھی بھوکے نہیں رہا کرتے (۹) باطل کے مقابل حق کو لانا تھا (۱۰) کفر کے مقابل اسلام کو پیش کرنا تھا (۱۱) انسانی مساوات کا مظاہرہ پیش کرنا تھا (۱۲) آزادی اور غلامی کا مفہوم سمجھانا تھا (۱۳) ظلم اور عدل کا فرق بتانا تھا (۱۴) عدل و احسان اور ایثار و قربانی کی روایات قائم کرنی تھیں (۱۵) جہاد کی رسم جاری کرنی تھی (۱۶) غازی اور شہید کے مرتبے سے دنیا کو آگاہ کرنا تھا (۱۷) نفرتوں کے اندھیروں میں محبتوں کے چراغ روشن کرنے تھے (۱۸) اللہ کی صفات سے انسانوں کو روشناس کرنا تھا (۱۹) لوگوں کو نبیوں کے مقام سے آگاہ کرنا تھا (۲۰) عبادت کے معنے سمجھانے تھے (۲۱) دین اور مذہب کا فرق بتانا تھا (۲۲) بتانا تھا کہ مومن کون ہوتا ہے اور کافر کسے کہتے ہیں (۲۳) حرام اور حلال میں تمیز کرنا بتانا تھا (۲۴) حقوق اللہ اور حقوق العباد سے آگاہ کرنا تھا (۲۵) قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ مہلت سے شناسا کرنا تھا (۲۶) ہر غلامی کو ختم کر کے آزادیوں کو رواج دینا تھا۔ (۲۷) ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری، نظامِ خانقاہیت اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی تمام توہم پرستیوں کا خاتمہ کرنا تھا اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام تھے جنہیں سرانجام دینے اور متعدد گھمبیر مسائل کو حل کرنے کے لئے اس پہلی بزمِ طلوعِ اسلام کے اراکین کے پاس بہت ہی کم وقت تھا۔ ذمہ داریوں کے اس شدید احساس نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ لیکن ان اراکینِ بزم نے اپنے دینی اور ملی جذبوں اور ولولوں کے تحت اپنے عالمِ بے سروسامانی کے باوجود وہ کارہائے نمایاں کر کے دکھائے کہ تاریخ عالم حیران رہ گئی۔

صاحبو! اُس بزم کو اگر کٹھن اور مشکل حالات کا سامنا تھا تو اس بزم کے سامنے بھی انسانی مسائل کا ایک انبار بلکہ کوہ ہمالیہ کھڑا منہ چڑا رہا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) موجودہ دنیا کے نظامِ سیاست کو لیجئے جس میں ملوکیت مختلف رُوپ دھارے جسدِ انسانی میں اپنے استبدادی پنجے گاڑے کھڑی ہے اور انسانیت کے زخموں سے رستے خون کو چاٹتی نظر آتی ہے۔

(۲) مذہبی پیشوائیت کے دیو استبداد نے انسانیت کی بوٹی بوٹی نوچ کر اس کی روح کو بھی کچل ڈالا ہے انسانوں کو مذاہب اور فرقوں کے علاوہ اختلافی نظریات اور عقیدوں پر مبنی ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اور دلوں سے محبتوں کی دولت چھین کر ان میں نفرتوں کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ اور بندے کو بندے کا دشمن اور ویری بنا رکھا ہے یہ مذہبی پیشوا ہمیں اللہ کے فرمودات اور انبیائے کرام کی تعلیمات سے بہت دُور لے جا چکے ہیں حقائق کی راہِ مستقیم سے ہٹا کر باطل کی غلط راہوں پر لگا رکھا ہے اور روایاتی افسانوں میں الجھا رکھا ہے۔

(۳) غلط اور ظالم نظامِ سرمایہ داری بڑے بھیانک انداز سے انسانوں کا خون چوسنے میں مصروف ہے۔

(۴) مذہبِ تصوف نے نظامِ خانقاہیت قائم کر کے اپنے عقیدۂ وحدت الوجود اور عقیدۂ حلول کے ذریعے اللہ

ے نظام وحدانیت کے مقابلہ میں آگ الگ اور مختلف معیار رکھا ہے۔ اور پورے عالمِ انسانیت کو توہمات کی دلدل میں اس طرح پھنسا رکھا ہے کہ جو شخص اس ظالم دلدل سے نکلنے کی سعی کرتا ہے وہ مزید نیچے دھنس جاتا ہے۔

پورا عالمِ انسانیت ظلم و استبداد میں جکڑا ہوا تڑپ رہا ہے اور باہمی نفرتوں کی بھیانک آگ میں جل جل کر بھسم ہو رہا ہے۔

صاحبو! ان اندھیروں میں اور نفرتوں اور مظالم کی ان مسموم فضاؤں میں آج کی دکھی انسانیت کو صرف اور صرف اسلام کے سایۂ عاطفت میں ہی پناہ مل سکتی ہے اور سکون اور امن کی دولت یہیں سے میسّر آسکتی ہے۔ اس کے دکھتے اور رستے زخموں پر رکھنے کے لئے پھاہے صرف یہیں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اسلامی اقدار پر عمل پیرا ہونے سے جہالتوں کے تمام اندھیرے چھٹ سکتے ہیں۔ قرآنی افکار سے انسانیت کو لاحق ہر مرض کا مداوا ہوسکتا ہے۔ محبتوں کے چراغ جلا کر ہر اندھیری راہ کو روشن کیا جاسکتا ہے۔ اور خلوص، عدل و احسان اور ایثار و قربانی سے اور ہر ظلم کے خلاف عملِ جہاد سے امن اور سکون کی فضا قائم کی جاسکتی ہے۔ اور پیار کی خوشبوئیں بکھیر کر ہر مشامِ جان کو معطّر کیا جاسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ عظیم کام جنہیں بزمِ طلوعِ اسلام کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر احسن طریقے سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ آغازِ کار کے وقت عملی کاروائی کے لئے مندرجہ ذیل ترجیحات قائم کی جانی ضروری ہیں۔

(۱) اراکینِ بزم کی تعداد میں اضافہ کیا جائے

(۲) اراکینِ بزم کے قلوب و اذہان کو قرآنی افکار سے منوّر کیا جائے۔ اس کے لئے طریقہ یہ اپنایا جائے کہ بزم کے اجلاسوں کے دوران تبادلۂ خیالات۔ تبادلۂ علم۔ تبادلۂ معلومات اور تبادلۂ افکارِ قرآنی کا ایسا اہتمام کیا جائے، محبت، خلوص۔ ایثار اور اخوت کی ایسی فضا اور یگانگت کا ایسا معیار قائم کیا جائے کہ یہ بزم قرآنی تعلیمات کی ایک درسگاہ کی حیثیت اختیار کر جائے تاکہ اراکینِ بزم اس درسگاہ سے فیض یاب ہونے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد ایک مبلّغ کی حیثیت سے قرآنی افکار کی خوشبوئیں ہر جانب بکھیرتے پھریں۔

صاحبو! یقین کیجئے کہ مسلمانوں کے علاوہ بھی صدیوں سے مظالم اور دکھوں کی ماری اور سسکتی انسانیت جو کفر و الحاد، شرک اور توہّم کی ڈسی ہوئی ہے جسے مذہبی پیشوائیت نے نیم جان کر رکھا ہے۔ ملوکیت کے حربوں اور سرمایہ داروں کی مکاریوں، عیّاریوں اور فریب کاریوں کی زخم خوردہ ہے اور جو انسان ان مستبد نظاموں سے صدیوں سے پِستے چلے آرہے ہیں اور کفر، شرک، توہّم، باطل اور فریب کاریوں سے تنگ اور متنفر ہیں اور جو حق کے متلاشی ہیں جو ظلم کے بجائے عدل، نفرتوں کی بجائے محبّت کے طلبگار ہیں۔ وہ آپ کا استقبال کرنے کے لئے چشم براہ ہیں۔ یہ لوگ رہزنوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ اب یہ کسی ایسے راہنما کے منتظر ہیں جو انہیں محبّت، امن اور سکون

کی دولت سے مالا مال کر سکے۔

صاحبو! برسوں کی تحقیق کے بعد نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ ہم قرآنی افکار کے گلدستوں، اسلامی اقدار کی روشنیوں اور اسلامی مساوات کی خوشبوؤں سے ان کے اذہان و قلوب کو مہکا سکتے ہیں۔ میں نے اپنے نامکمل مقالے "اک عرضِ تمنّا" کے اقتباسات سے مزیّن جو گذارشات پیش کی ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان پر کھلے دل اور خلوصِ محبّت کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ تاکہ نئے سفر کے دوران آپ کا تعاون اور محبتیں زادِ راہ کا کام دے سکیں۔ ہمارے پیشِ نظر ایک واضح نصب العین اور لائحۂ عمل ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہم اپنے خواب و خیال۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے خاکوں میں حقیقتوں کے رنگ بھر سکیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اہم اور تاریخی واقعات نے انہی خوابوں اور خیالوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ انسان کے خواب و خیال کوئی بیکار چیز نہیں ہوا کرتے۔ کسی بھی منصوبے کی تکمیل کے لئے بنیاد کا کام یہی خواب و خیال دیا کرتے ہیں۔ خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو تاکہ ہم تن آسانیاں ترک کر کے عملی جدوجہد میں مصروف ہو سکیں۔ آمین!

طلوعِ اسلام خود پڑھیئے۔ دوسروں کو پیش کیجئے!!

ہو سکتا ہے

- غور و فکر کرنے والے انسان ہمارے ہمنوا بن جائیں
- ناواقف اس کے متعلق سوچنا شروع کر دیں

اور

- مخالفین پر ایک بار پھر ظاہر ہو جائے کہ طلوعِ اسلام زندہ ہے

قومی اسمبلی نے شریعت بل منظور کر لیا (خبر)
قرآنِ حکیم کی روشنی میں تبصرہ کیلئے طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

بشیر احمد عابد
(کراچی)

قانونِ مکافاتِ عمل

طبیعیات میں حرکت کا ایک مسلّمہ قانون ہے کہ ہر عمل کا ایک ردّ عمل ہوتا ہے جو کہ شدت میں برابر لیکن سمت میں اس کے مخالف ہوتا ہے۔ اس قانون کو تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ "قانونِ مکافاتِ عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل، دراصل اعمال کے یقینی بدلے کو کہا جاتا ہے اور اس کا تعلق بالعموم انسان کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ طبعی قوانین و معاشرتی قوانین میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر کی صحت کو تجربات کی روشنی میں پرکھا اور ثابت کیا جا سکتا ہے جب کہ موخر الذکر کے ضمن میں بعض اوقات ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

کئی انسانی اعمال اپنے نتائج ٹھیک مرتب کرتے نظر نہیں آتے اور بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ رائیگاں گئے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھے اچھے اہلِ علم قانونِ مکافاتِ عمل کی صحت کے بارے میں متذبذب ہوتے ہیں۔ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (۴ : ۱۴۳) ان کی کیفیت کیوں ایسی ہوتی ہے کہ نہ تو وہ اس سے انکاری اور نہ ہی پورے وثوق سے یقین کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے مکافاتِ عمل کو اللہ اور آخرت پر ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ تسلیم کرنا کہ خدا کے ہر قانون کا ایک حتمی نتیجہ ہوتا ہے، جو ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اٹل اور غیر متبدل ہوتا ہے اور اس کے نتائج سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ حتیٰ کہ رسول بھی۔

قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶ : ۱۵)

"اے رسول! ان سے کہو، میں قانونِ مکافاتِ عمل سے سخت خائف ہوں۔ اگر کسی قانون کی خلاف ورزی ہوگئی تو اس کی پاداش سے میں بھی نہیں بچ پاؤں گا۔"

حیاتِ اخروی یا تسلسلِ حیات کا تصوّر بھی اسی قانون سے وابستہ ہے یعنی جب ہم قانونِ مکافاتِ عمل کو تسلیم کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم حیاتِ اخروی یا تسلسلِ حیات کی حقیقت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ قانون طبیعیات کا ہو یا معاشرتی اس کائنات میں سبھی خدا کے قوانین کارفرما ہیں۔ انسان یا تو ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں یا ان کے علی الرّغم اپنے قوانین وضع کر لیتے ہیں۔ ثانی الذکر صورت ان قوانین کی خلاف ورزی کہلاتی ہے۔ صورتِ حال کیسی ہو۔ نتائج بہرحال خدا کے قوانین کے مطابق ہی نکلتے ہیں اور انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (۶ : ۳۴)۔ طبعی قوانین کا تعلق مادے سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نتائج کے اعتبار سے نہایت ٹھوس ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج کو محسوس شکل میں ظاہر ہونے کو زیادہ دیر نہیں لگتی۔ لوگ انہیں تسلیم کرنے میں زیادہ کٹ حجتیاں یا شک و شبہ بھی نہیں کرتے۔ سائنس دان اس کی فوری تشریح کر دیتے ہیں۔

اور اس شک میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب اس کی معقول تشریح نہیں مل پاتی۔ ہمارے معاشرے میں یہ ذمہ داری علمائے دین نے اٹھا رکھی ہے کہ وہ اس ظلم و ناانصافی کی وجوہات بیان کریں۔ مگر جس انداز سے یہ بیان کرتے ہیں اس طرح تو یہ کائنات ایک جہنم اور بھی لے لے تب بھی لوگ اللہ اور آخرت یعنی قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھیں گے۔ وہ اس لئے کہ یہ حضرات اس سارے قضیے کا بنیادی سبب (معاذ اللہ) خود اللہ کی ذات کو ٹھہرا دیتے ہیں۔ ان کی فہم و بصیرت اور دانش و بینش کے مطابق یہاں جو کچھ ہو رہا ہے سب منشاءِ خداوندی ہے گمراہی، ضلالت، عزت، جہالت، دولت، عزّت، شہرت۔ غرضیکہ جس کے پاس جو کچھ ہے سب خدا کی دین ہے اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے، جسے چاہے عزّت دے، جسے چاہے ذلّت دے! جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے دے۔ ذرا سوچیئے! جس خدا کے بارے میں لوگوں کو ایسے تصوّرات دیئے جائیں کیا ان سے توقّع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ صدقِ دل سے اس خدا کے عدل و انصاف پر یقین رکھیں۔

آج معاشرہ جس عدم توازن کا شکار ہے، وہ ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہر فردِ معاشرہ کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اور کوئی بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو صدق و یقین کی دولت سے مالا مال ہو۔ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ حج کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں، لیکن کسی کو یقین نہیں ہوتا کہ ان اعمال کے عوض سے جنّت ملے گی۔ چائے کیلئے پانی چولہے پر اس لئے رکھا جاتا ہے کہ وہ اُبلے گا اور چائے بن جائے گی۔ اسے کہتے ہیں یقین کے ساتھ عمل کرنا اور کوئی عمل اگر اس طرح کے یقین سے عاری ہے تو خود فریبی ہے۔

معاشرے کی اکثریت خود فریبی کا شکار ہے اور یہ ایک ایسی لعنت ہے جو انسانی ذات کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا بنا دیتی ہے۔ ایسے انسان کو خود نہ اپنے عمل میں یقین ہوتا ہے اور نہ گفتگو میں اعتماد۔ ایسے لوگ میں حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر پاتا خواہ اس کے ارباب

اقتدار کتنی ہی اعلیٰ منصوبہ بندی کیوں نہ کریں!

قانونِ مکافاتِ عمل، خدا کے قوانین کی اساس ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس کائنات کے ہر گوشے میں صرف خدا کے قوانین کی عملداری ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۔ (۶:۳)۔ اگر یہ قوانین طبعی کائنات میں ٹھیک ٹھیک نتائج مرتّب کر رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ قوانین جن کا تعلّق انسان کی سماجی و معاشرتی زندگی سے ہے۔ اپنے نتائج صحیح طور پر مرتّب نہ کریں۔ قانونِ مکافاتِ عمل پر عدمِ یقین کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان قوانین کے نتائج ظاہر ہونے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے جب کہ لوگوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جن قوانین کے تابع وہ زندگی بسر کریں ان کے نتائج فوری سامنے آجانے چاہئیں۔ لوگ موت کو زندگی کا اختتام سمجھتے ہیں اور مرنے سے پہلے اپنے اعمال کو بارآور ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کی اسی نفسیاتی کمزوری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو دنیوی اور اُخروی فلاح کے لئے شرطِ اوّلین قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس موضوع کو نہایت بلند علمی دلائل سے واضح کیا ہے اور اچھی طرح یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ انسان کا کوئی عمل بھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہے۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶:۶۷)

"ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ تاآنکہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے اور اس کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر کہا:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷:۱۸۲)

جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ ان کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی، ہم انہیں آہستہ آہستہ بتدریج تباہی و بربادی کے اس مقام تک لے آتے ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔"

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۷:۱۸۳)

استدراج، دراصل ان کے لئے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ شاید سنبھل جائیں ورنہ یہ بات نہیں کہ ان کی غلط کاریوں پر گرفت کرنے والا ہی نہیں ہم نے ان کے لئے نہایت محکم تدبیر اختیار کر رکھی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ لوگ قرآنِ کریم کا مطالعہ نہیں کرتے ورنہ مکافاتِ عمل کی حقیقت لوگوں کے دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جائے اور جو اس کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں وہ مخصوص مفادات کے تحت لوگوں کی توجہ کچھ عبادات اور کچھ سزاؤں کی طرف دلانا ہی کافی سمجھتے ہیں ۔ ان لوگوں کا مبلغِ علم ہی اتنا محدود ہوتا ہے یا یہ استحصالی طبقے کے زیرِ اثر اپنے مفاد کیلئے ایسا کرتا ہے۔

ان کا مقصد لوگوں کو توہم پرستیوں میں مبتلا کر کے چند انسانیت دشمن انسانوں کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے ان حضرات کا تعلق، سیاست، معیشت اور مذہب سے ہوتا ہے اور یہ عامۃ النّاس سے قدرے زیادہ ہشیار اور مقدِ عامیہ کے دلدادہ ہوتے ہیں ۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنا تسلّط چاہتے ہیں اور ان کی خواہش کے راستے میں خدائی قوانین زبردست رکاوٹ ہوتے ہیں ۔ ان کا اقتدار اور بالادستی صرف انہی کے وضع کردہ قوانین سے قائم ہو سکتی ہے ۔ قرآن کریم آج ایک عرصہ سے ان کے ستم کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے ۔ نتیجتاً ان سے عقیدت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن یقین محکم کبھی نہیں پیدا ہو پاتا ۔ لوگ ریب و تشکیک کا شکار رہتے ہیں اور پھر وہ اجتماعی طور پر تو درکنار اپنی انفرادی زندگی میں بھی ان تعلیمات پر پورے اعتماد سے عمل نہیں کر پاتے ۔ اس رنگ آمیزی کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے ۔ معاشی نظام کے ضمن میں قرآن کریم کا ایک حکم ہے ۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۔ اس کا مفہوم تھا کہ معاوضہ صرف محنت کا ہو گا ۔ ہر فرد کو محنت کرنی پڑے گی اور محنت کی کمائی کا استحصال نہیں ہونے دیا جائے گا ۔ محنت اور محنت کا تحفّظ، معیشت کی نہایت اعلیٰ قدر ہے ۔ اور معاشی ترقی کی ضامن ہے اگر لوگ اسی اہم قدر سے آگاہ ہوتے اور یہ ان کے ایمان کا جزو ہوتی تو اندازہ کیجئے کتنی معاشی برائیوں کا سدِّباب ہو جاتا ۔ لیکن ان اہلِ مذہب کی بھٹی سے نکل کر یہ حکم جب سامنے آتا ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔ ان کے مطابق محنت کی کمائی سے مراد روزی نہیں بلکہ نیکیاں کمانا ہے اور کسی کی نیکی دوسرے کو نہیں دی جا سکے گی ۔ روزی کمانا اور نیکی کمانا، جب الگ الگ معنی اختیار کرتے ہیں تو پھر جو انجام معاشرے کا ہوتا ہے ۔ اس پر مگر مچھ بھی رونا پسند نہیں کرتے ۔ ایک ہاتھ سے سُود لیا اور دوسرے ہاتھ سے زکوٰۃ دیدی ۔ ایک سے چوری کی اور دوسرے سے چندہ دے دیا ۔ وقس علیٰ ذالک ۔

اہلِ مذہب کی دسیسہ کاریاں مفاہیم ہی بدلنے تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ یہ نظامِ خداوندی کے بنیادی تصوّرات تک کو بدل دیتے ہیں ۔ اس وقت دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو گا جو اللہ اور آخرت پر ایمان سے انکاری ہو ۔ لوگ اس ایمان کا مفہوم بھی اچھی طرح جانتے ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ مرنے کے بعد خدا کے حضور اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا تو پھر اتنی دیدہ دلیری کیوں؟ جواب ملے گا ۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْم ۔ "تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے"

اللہ اور آخرت پر ایمان کا یہ تصوّر اہلِ مذہب کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ قرآنِ کریم کی تعلیمات عدل کا تصوّر دیتی ہیں اور کسی بھی عادلانہ نظام میں بخشش اور مہربانی کے تصوّرات متضاد خیال کئے جاتے ہیں۔

اہلِ مذہب ایک تو کتاب اللہ کی اصطلاحات اور تعلیمات کا مفہوم بدل دیتے ہیں اور اس پر مزید ستم یہ کرتے ہیں کہ اس تبدیلی کے جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ کر لیتے ہیں یعنی زندگی کے ہر معاملے میں ان کا فیصلہ حرفِ آخر بن جاتا ہے۔ پہلے پہل ان کی یہ چودھراہٹ طبعی کائنات میں بھی قائم تھی اور اس سلسلے میں ان کی پیش کردہ تھیوریاں آئن سٹائن کی تھیوری سے بھی زیادہ معتبر سمجھی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ زمین ساکن ہے، اور سورج گردش کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے نظریات سے اچھے اچھے اہلِ علم حضرات اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ سنا ہے کہ جس سائنسدان نے ان کے نظریہ کے علی الرغم زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اسے انہوں نے سولی پر لٹکا دیا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ طبعیات کی دنیا میں حقائق کو زیادہ عرصہ تک چھپایا نہیں جا سکتا۔ سائنسدان اپنے تجربات اور مشاہدات سے بہت جلد ان کے ثبوت فراہم کر دیتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ نوعِ انسان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ خاص احسان ہے کہ خارجی کائنات مولویوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہے ورنہ جس طرح انسان کی عمرانی ترقی پر جمود طاری ہے۔ اسی طرح مادی اعتبار سے بھی نوعِ انسان ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتی۔

ذرا سوچئے! اگر نیوٹن کی جگہ کوئی مولوی صاحب سیب کے گرنے کا مشاہدہ کر رہے ہوتے تو آج کیا صورتِ حال ہوتی؟ میں زیادہ تو نہیں جانتا۔ البتہ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نہ تو کششِ ثقل کا قانون دریافت ہوتا اور نہ ہی انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے قابل! مولوی صاحب نے تو فقط اتنا کہنا تھا کہ یہ سیب خدا کی قدرت سے گرا ہے۔ اور خدا کی قدرت پر زیادہ بحث مباحثہ کرنا شریعت کے منافی ہے۔ ان کا یہی طرزِ عمل انسان کے معاشرتی جمود کا باعث ہے۔ انسان جس حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے ذرہ بھر بلند نہیں ہوا۔ انبیاء کرام کے ادوار اس میں استثناء ہیں۔ پانچ ہزار سال پہلے بھی مقصدِ حیات نفس پرستی تھا اور آج بھی یہی کیفیت ہے۔ پہلے بھی انسان کے سامنے بلند اقدار نہیں تھیں اور آج بھی یہ غائب ہیں اور اس ساری ٹریجڈی کی ذمہ داری اہلِ مذہب پر عاید ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم انسانی شرف و مجد اور رفعت و عظمت کا نظام پیش کرتا ہے۔ ان ھو الا ذکری للعلمین (واضح رہے کہ ذکر کے ایک معنی شرف و مجد کے بھی ہیں) یہ نظام ایسے قوانین اور اصولوں پر مبنی ہے جو انسانی معاشرے کو یک لخت ایک نہایت اعلیٰ سطح پر پہنچا سکتے ہیں یوں جیسے اللہ کے ایک برگزیدہ رسول نے آج سے چودہ سو سال پہلے کر دکھایا تھا۔ اللہ اور آخرت پر غیر متزلزل ایمان اس

نظام کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کے بغیر یہ نظام تاش کے پتوں کا گھروندہ ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ا
مذہب نے اس نظام کا کیا حشر کر رکھا ہے۔ ایسی کمزور اور متزلزل بنیاد پر قائم یہ نظام معاشرتی ترقی کا سبب کیسے
بنے گا؟ اللہ اور آخرت کے صحیح تصوّر کے بغیر یعنی قانونِ مکافاتِ عمل پر اگر یقین نہ ہو تو یہ نظام انسانوں کے وضع
ایک عام نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں کہ اطاعت و فرمانبرداری کا مقصود صرف مفادِ عاجلہ کا حصو
ہوتا ہے۔ جیسے ہی مقاصد حاصل ہوئے۔ انسان خود کو اقدار و قوانین سے مبرا سمجھنے لگتا ہے۔ آپ نے مشا
کیا ہوگا کہ جب کوئی انسان نیا نیا کاروبار شروع کرتا ہے تو وہ نہایت خلوص اور دیانت داری کا مظاہرہ کرتا
وہ گاہکوں سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے گا اور دام بھی مناسب لگائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ وہ
کاروبار کو چمکانے کی خاطر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ان۔ اعلیٰ اقدار کی اہمیت عارضی ہوتی ہے۔ جونہی مقص
براری ہوئی اس کا رویّہ بدل جاتا ہے۔ اگر اس کا مکافاتِ عمل پر پختہ ایمان ہو، اور اسے یہ یقین ہو کہ بالآخر ایک د
خدا کے رُوبرو حاضر ہو کر اپنے اعمال کا آڈٹ کروانا ہے۔ تو وہ کبھی بھی زندگی کی اعلیٰ اقدار سے روگردانی نہیں
کرے گا۔ وہ ہر مفاد سے بلند ہو کر ان پر عمل پیرا ہوگا۔ اور جب ہر فردِ معاشرہ کا ایسا ہی طرزِ عمل ہو اور اس کے
عزم و ارادہ میں ایسی ہی پختگی پائی جائے تو پھر وہ معاشرہ کیونکر ترقی نہیں کرے گا؟ اللہ اور آخرت پر ایمان یعنی
قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین انسان میں احساسِ ذمّہ داری پیدا کرتا ہے۔ اس ایمان سے انسان اپنا احتساب خو
کرتا ہے۔ اس ایمان کے حامل افراد زندگی کی اعلیٰ اقدار کو روندتے نہیں بلکہ ان کے محافظ و نگہبان بن جاتے ہیں
(وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ) (واضح رہے کہ صلوٰۃ کے ایک معنی فرائضِ زندگی کی بھی ہے
وہ ہر منفعت سے بلند ہو کر صرف اور صرف نوعِ انسان کی منفعت کیلئے کام کرتے ہیں (بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ
وہ اپنی ضروریات کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کی ضروریات پوری کرتے ہیں (وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط) وہ رنگ، نسل، قوم اور وطن کی تنگناؤں سے نکل کر بحرِ بیکراں بن جاتے
ہیں، وہ تکریمِ انسانیت کی شمع ہوتے ہیں۔ اختلافات کو مٹا کر اتحاد و یکجہتی کو فروغ دیتے ہیں اور اس جدوجہد
میں وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ حتّٰی کہ جان تک کی پرواہ نہیں کرتے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتے
ہیں کہ۔ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ قانونِ مکافاتِ عمل پر ان کا پختہ یقین ہوتا ہے۔

انسان عرصۂ دراز سے ایک محکم نظام کی تلاش میں ہے اسے اپنے معاشرے میں امن و استحکام چاہیئے
اور اس کا حصول بغیر محکم نظام کے ممکن نہیں۔ کسی نظام کی محکمیت کا انحصار محکم قوانین اور مؤثر قوتِ نافذہ پر ہوتا
ہے۔ یہ دونوں اس کے لئے اساسِ محکم فراہم کرتے ہیں۔ محکم قوانین سے مراد ہوتی ہے، ایسے قوانین جن کے نتائج
اٹل اور غیر متبدّل ہوں۔ خدا کا قانونِ اٹل ہے۔ اس میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوتی۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

سے کہتے ہیں دین القیّم، یعنی محکم قوانین پر مبنی محکم نظام (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے نابلد ہوتی ہے۔ (۳۰ : ۳۰)۔

محکم قوانین کی طرح، مؤثر قوتِ نافذہ بھی محکم نظام کی کامیابی کیلئے ضروری ہوتی ہے۔ اگر قوتِ نافذہ مضبوط، اٹل اور غیر متزلزل ہو تو پھر اطاعت انتہائی ذمہ داری سے کی جاتی ہے۔ برعکس اگر اتھارٹی کا رویہ مشکوک ہو اور معلوم نہ ہو سکے کہ کسی معاملہ میں اس کا یقینی فیصلہ کیا ہوگا۔ تو لوگ بدگمان ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ قوانین کی پابندی مصلحتاً کرتے ہیں۔ مثلاً قتل کی سزا پھانسی ہے۔ اگر یہ بات عام ہو جائے کہ جج کو کچھ دے دلا کر نجات حاصل کی جا سکتی ہے تو اس کے بعد اس قانون کو کتنا ہی نکھار کر پیش کیا جائے یا اس سے ڈرایا دھمکایا جائے، لوگوں کا اس پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ ٹھیک ہے وہ قتل نہیں کریں گے لیکن ضرورت پڑی تو اس سے گریز بھی نہیں کریں گے۔

خدا کے قوانین اور انسانوں کے وضع کردہ قوانین میں یہ ایک نہایت اہم اور بنیادی فرق ہے۔ ثانی الذکر قوانین کو نافذ کرنے کیلئے قوتِ نافذہ خارج سے درکار ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انہیں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے نہیں تو یہ قوانین مردہ ہوتے ہیں۔ کوئی حکمران ایسے قوانین نہیں دے سکتا جو زندہ ہوں اور اپنے سہارے قائم رہ سکتے ہوں۔ ماسوائے اللہ کے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ فقط وہی ایک حکمران ہے جو زندہ و پائندہ قوانین دے سکے۔ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ اس لئے کہ وہ خود بھی زندہ ہے اور کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔

خدا کے قوانین اپنی قوتِ نافذہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مثلاً قانون یہ ہے کہ آگ جلاتی ہے تو اس قانون کے نفاذ کے لئے کسی مجسٹریٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ زندہ قانون ہے اور اپنے نفاذ کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ آگ میں جو بھی ہاتھ ڈالے گا، جل جائے گا۔ خدا کے ہر قانون میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق طبعی دنیا سے ہو یا انسان کی معاشی و معاشرتی زندگی سے۔ قانون ہے کہ تفرقہ اور باہمی اختلاف سے قومیں ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اب جو قوم بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرے گی۔ اس کے حتمی انجام سے بچ نہیں پائے گی۔ خدا کے قوانین میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں پائی جاتی۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۳ : ۳۵) اگر یقین نہ آئے تو کہا:۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ : (۳ : ۱۳۶) یہ کوئی نئی بات نہیں جو پہلی بار سامنے آئی ہو۔ خدا کے قوانین ابدی ہوتے ہیں، اور شروع سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ تم سے پہلے بہت سے نظام اور اقوام گذر چکی ہیں۔ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو، تمہیں نظر آ جائے گا کہ قوانینِ خداوندی کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

قارئینِ کرام! ان توضیحات و تشریحات کے بعد یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ خدا کے قوانین اٹل اور غیر

متبدل نتائج کے حامل ہیں۔ یہ زندہ قوانین ہیں اور اپنی قوتِ نافذہ خود اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ انہیں کسی بھی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ان کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ انسان کو ان کی خلاف ورزی کی پاداش بہرصورت بھگتنی پڑتی ہے۔ اسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور یہی آخرت پر ایمان۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اس پر یقین کیوں نہیں کرتے؟ لوگ آگ کی حقیقت کو تو تسلیم کر لیتے ہیں اور کوئی اس میں ہاتھ بھی نہیں ڈالتا لیکن کیا وجہ ہے کہ تفرقہ اور اختلاف سے جو آگ بھڑکتی ہے، لوگ اس میں مزے لے لے کر چھلانگیں لگاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ہمارے سامنے آگئی یعنی ٹھوس اور فوری نتائج۔ آگ اپنا نتیجہ فوری اور ٹھوس شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب کہ تفرقہ بازی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ تفرقہ بازی کے اثرات بھی کچھ کم مہلک نہیں ہوتے۔ لیکن یہ سب تباہی و بربادی کچھ ایسے انداز پر ہوتی ہے کہ انسان کو اس کا احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ اس کا سبب تفرقہ ہے مِنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ تفرقہ بازی میں ملوث ہونے کی دوسری وجہ جہالت ہوتی ہے ہم جانتے ہیں [illegible]، جو [illegible] خمسہ سے ہے۔ یہ حواس جس شئے کو بھی محسوس کریں گے۔ انسان اسے تو تسلیم کرے گا [illegible] انسان کے عقل و شعور سے ہے۔ یہ آگاہی انسان کے عقل و شعور کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ عقل و شعور کی نشوونما کے لیے صحیح تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ لوگوں کی عقل و شعور کی نشوونما پر بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں گھر کا ماحول، معاشرتی اقدار، معاشی حالات اور سب سے گہرا اثر مذہب کا ہوتا ہے۔ یہ عوامل اگر پست اور پامال شدہ ہیں تو انسانی شعور میں بھی پستی ہوگی اور اس پر جہالت اور توہم پرستی کے پردے پڑ جائیں گے۔ ایسی عقل و شعور کے حامل افراد زندگی کی اعلیٰ اقدار کو سمجھنے اور اپنانے سے قاصر ہوں گے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَیَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ۔ (۱۰ : ۱۰۰)

"ایمان لانے کے لئے بھی خدا کا ایک قانون مقرر ہے اور یہ ہے عقل و بصیرت کا استعمال۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار صرف عقل کی رُو سے سمجھی جا سکتی ہیں، ورنہ ان کی حقیقت ہمیشہ مشتبہ رہتی ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگ۔ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا اس نظام میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ کہا: قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ یہ صحرا نشین بدو ہمارے نظام میں یوں داخل ہو کر سمجھتے ہیں کہ ایمان لے آئے: قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا۔ ان سے کہو قطعی نہیں۔ ایمان اس طرح نہیں لایا جاتا۔ وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا: تم نے ابھی صرف سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ

فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۱۴ : ۴۹) ایمان وہ ہوتا ہے جب کوئی بات دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اسے تسلیم کر کے سکون واطمینان حاصل ہو۔ اور ایسا صرف عقل وبصیرت کے استعمال سے ممکن ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ علم وشعور کی نشوونما پر جو عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ان میں سب سے زہریلا اثر اہلِ مذہب کا ہوتا ہے۔ یہ حضرات خدا اور رسول کی زبان بن کر مخاطب ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں اور بلا حیل وحجت تسلیم کر لیتے ہیں اور یوں اپنی عقل کے استعمال سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انسان صدیوں سے ایک اچھے نظام کی تلاش میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور ایک محکم نظام عطا کر دیا۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ؕ (۷ : ۹۳)

"اے رسول ہم نے تجھے حقیقت کی تلاش میں سرگرداں پایا اور تیری راہنمائی کر دی۔"

رسول کی ساری زندگی یہ ثابت کرنے میں بیت گئی کہ یہ ایک فعّال نظام ہے اور نوعِ انسان اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ اس کے احکام وفرامین کے نتائج اسی دنیا میں ثمر بار ہوں گے۔ اہلِ مذہب نے اس ساری کاوش پر پانی پھیر دیا کہ جو کچھ ہو گا وہیں دیکھا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی پاداش میں جل رہا ہے لیکن اس سے غافل، ہر فردِ معاشرہ اس جہنم کا منتظر ہے جو خدا نے وہاں تیار کر رکھی ہے۔ آپ کسی مولوی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ اے مسلمانو! تم اس وقت جس ذلت وخواری اور جہالت وافلاس کا شکار ہو، یہی تو خدا کا عذاب ہے! ہر مولوی کہے گا۔ خدا کا عذاب آنے والا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے اپنے گناہوں سے توبہ کر لو۔ لوگ مصائب ومشکلات میں مبتلا ہیں، کمر توڑ مسائل سے دوچار ہیں معاشی مشکلات! معاشرتی بگاڑ! دو وقت کے کھانے کو روٹی نہیں۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں! ہر طرف بدامنی اور بدحالی کے سیاہ بادل چھائے ہیں لیکن کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں کہ یہ فقط۔ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام، قوانینِ خداوندی کی نقیب ہے۔ وابستگانِ تحریک کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں۔ خود بھی قوانینِ خداوندی کا اتّباع کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں اور لوگوں کو سمجھائیں کہ ان کے مسائل کا حل فقط، قرآنِ کریم ہے۔ صرف انہی قوانین پر عمل کر کے معاشی ومعاشرتی عذاب سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان مسائل کو نہ تو سیاست دان حل کر سکتے ہیں، نہ صنعت کار اور جاگیر دار اور نہ ہی مولوی صاحبان۔ بلکہ ان کا بنیادی سبب یہی تین طبقات ہیں۔ یہ طبقے خدا کے قوانین کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی نگاہوں سے ان قوانین کو اوجھل رکھتے ہیں اور یوں معاشرے کو جہنم بنا دیتے ہیں پہلے اس میں لوگ جلتے ہیں اور پھر یہ خود بھی اس کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

لوگوں کو بتلائیے! کہ جن لوگوں کو آپ نے اپنا ملجا و ماویٰ سمجھ کر ووٹ دیئے ہیں اور مسیحا بنا کر اقتدار کے ایوانوں میں بٹھاتے ہیں، وہی لوگ تو آپ کے مسائل و مشکلات کا سبب ہوتے ہیں۔ یہ تمہارے مسائل کیونکر اور کیسے حل کریں گے؟

لوگوں کو بتائیے! کہ تمہارے خارج میں اور تمہارے داخل ہیں۔ فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ صرف خدا کے قوانین کی کار فرمائی ہے۔ یہ قوانین از خود لاگو ہیں۔ یہ شرعی قوانین نہیں جنہیں اسمبلی سے منظور کرانا پڑے۔

خارجی کائنات ان قوانین پر چلنے کیلئے مجبور ہے وہ ان سے سرکشی کر ہی نہیں سکتی۔ دیکھو کہ یہ نظام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اگر کوئی کرّہ کوئی ستارہ اپنے مدار سے ذرّہ بھر ہٹ کر، گردش کرنا چاہے تو ساری کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔ ان کے سامنے دو راستے ہیں ہی نہیں۔ یہ محض انسان ہے جس کے سامنے دو راستے ہیں اور اسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے، چاہے صراطِ مستقیم اختیار کرے، چاہے تو کفر کا راستہ۔ مگر اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ان دو راستوں پر چلنے کا انجام کیا ہوگا۔ اس کی اس دنیا کی جنّت اور جہنّم اس کے اسی اختیار و ارادہ سے کئے گئے فیصلے پر منحصر ہوگی۔ اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ اس ACCOUN- TABILITY) کا بار اس نے خود ہی اپنے اوپر لیا تھا۔ اپنے اعمال کی ذمہ داری خود اس کی اپنی ہے۔ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ خدا نے تو نکھار کر، وضاحت سے اپنے احکام قرآن میں دے دیئے ہیں۔ یہ راہنمائی سب کیلئے ہے اور ہر وہ شخص جو اس دین کو مانتا ہے، جو خود کو ایمان لانے والوں میں شمار کرتا ہے فرض ہے کہ اس کتاب مبین سے روشنی حاصل کرے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ اسی میں اس کی اور انسانیت کی فلاح ہے۔

ارشادِ قائدِ اعظمؒ

اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ **امتیاز** ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع **خدا** کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ **قرآنِ مجید** کے احکام اور اصول ہیں اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علی محمد چدھڑ

فریضۂ رسالت

حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا جو کچھ انسانوں کی راہنمائی (احکام و ہدایات) کے لیئے دیا جانا مقصوٗ
وہ قرآن میں اپنی تکمیل تک پہنچ گیا اور قرآن کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کردیا۔ نبوّت تو ختم ہوگئی باقی رہا فریضۂ رسالت
ی خدائی احکام کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کے مطابق ایک نظام قائم کرنا۔ سو اسے امّتِ محمدیہ کے سپرد کردیا
۱۰۵ : ۳ ، ۲۲ : ۳۵) اسی تسلسل میں فرمانِ باری تعالےٰ ہے کہ:

" اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کو خود اپنے سامنے بھی رکھو
اور ان کا چرچا بھی کرو — اور ان کی عملی تنفیذ کے لیئے دن رات سرگرداں رہو۔ ($\frac{۲۳}{۴۱-۴۲}$)

ان احکامِ خداوندی کے مطابق فریضۂ رسالت ہمارے ذمہ ہوگیا۔ یعنی فکرِ قرآنی کو تمام بنی نوع انسان تک
پہنچانا کوئی اختیاری بات نہ رہی بلکہ لازمی قرار دے دیا گیا کہ ہم ہر صورت میں ایسا کریں۔ ظاہر ہے یہ کچھ خالص
نی تعلیم کے لیئے ہی کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم کرتے کیا ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے۔ خارج از قرآن یعنی فقہ د
روایات پر مبنی مواد دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک تو لوگ قرآنی تعلیم سے محروم رہ جاتے
ہیں۔ دوسرے اسلام کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک مبلّغ کے لیئے ضروری ہے کہ
وہ بنی نوع انسان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مسائل سے واقفیت رکھنے کے علاوہ زمانے کے تقاضوں
کے مطابق قرآن کی روشنی میں ان مسائل کا حل بھی پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اس وقت دنیا جس
کربناک کیفیت میں مبتلا ہے ہمارے لیئے لازمی ہے کہ وحی کی اہمیت کو اجاگر کریں اور بتائیں کہ زمانے
کوئی پرابلم ایسا نہیں ہے جس کا حل قرآن میں نہیں ہے اور یہ بھی کہ مستقل اقدار کا سرچشمہ سوائے قرآن کے
اور کوئی کتاب نہیں۔ لیکن عموماً ہوتا اس کے برعکس ہے۔ بد قسمتی ہماری یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس مساجد جیسے
مقدس اور وسیع پلیٹ فارم موجود ہیں وہاں اپنے اپنے مسالک کے مطابق اختلافی امور پر تو زور بہت دیا جاتا
ہے اور جو چیز خدا نے ان تمام اختلافات کو دور کرنے کے لیئے نازل کی ہے۔ اس کی آواز کے لیئے کان
ترس جاتے ہیں۔ باہر جانے والے جید علمائے کرام کو بھی لے لیجیئے جب وہ یورپین ممالک میں (بزعمِ خویش)

تبلیغ کے لئے جاتے ہیں تو وہ روایات اور فقہ کو بنیاد بنا کر متضاد معاملات کو اتنا ابھارتے ہیں کہ عام مسلمان سرپیٹ کر رہ جاتا ہے۔ مساجد کو تالے لگ جاتے ہیں اور فساد اور ہنگامہ آرائی میں بعض اوقات دیارِ غیر میں قتل تک کی نوبت آجاتی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ پریشان حال قومیں قرآن مانگ رہی ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کی ضرورت ہے اور ہم انہیں سنی سنائی خلافِ قرآن باتیں اسلام کے لیبل کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ اندازہ لگائیں اس سے اسلام کی کیا خدمت ہو رہی ہے اور ہم فریضۂ رسالت کس حد تک سرانجام دے رہے ہیں۔ اس سے تو الٹا منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک تو غیر مسلم اقوام کو ہمارے دین کا مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے دوسرے یہ کہ نئی اور تعلیم یافتہ نسل اسلام سے ہی بدظن ہو رہی ہے اس وقت ہماری یہی حالت ہے جو انقلابِ رُوس سے پہلے عیسائیوں کی تھی۔ یعنی پاپائیت اور خانقاہیت سے لوگ تنگ آچکے تھے۔ چند سرمایہ دار کروڑوں کا خون چوس رہے تھے۔ یہی حال ہمارا ہے۔ اگر ہم نے بھی کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی تو کسی لینن جیسے کمیونسٹ کے پیدا ہو جانے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر سوشلزم یا قرآنی نظریۂ حیات میں سے کسی کا انتخاب۔ اُس وقت لینن اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح دقیانوسی ہی خیال کرتا تھا۔ کاش ہم میں سے کوئی اسے قرآن پیش کر سکتا۔ اور اس طرح لینن اسلام سے اور اسلام لینن سے محروم نہ رہ جاتا۔ جناب عبداللطیف سیٹھی کا ایک مضمون بہ عنوان "لینن کیا تھا۔ اسے کیا سمجھا گیا۔ روزنامہ نوائے وقت کی ۲۸ اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اُس کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

> لینن نے اسلام کو بھی ایک عام مذہب ہی سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک دینی، دنیاوی معاملات میں اعتدال قائم کرنے کی تحریک تھی۔ لینن کی زندگی اور گہری سوچ کے نتائج کا مطالعہ کرنے کے بعد افسوس ہوا کہ ایسے شخص کو بروقت اسلامی دنیا سے کوئی سچا راہنما نہ ملا، جو اسلام کی صداقتوں کو اس پر واضح کرتا اور اس کے اعتراضات کا جواب دیتا۔ افسوس کہ اہلِ اسلام کی بداس تاریخی کوتاہی نے اتنے اچھے کارآمد۔ زیرک اور ذہین ترین باعمل فعال شخص کو اسلام سے محروم کر دیا۔ اور اسلام کو ایسے شخص کی ذہانت سے محروم ہونا پڑا۔ جس کی قوتِ کردار کی اسلام کو ضرورت تھی ..... اسلام اپنے مشن میں کامیاب اس وقت ہوگا جب وہ ایک خدا پرست لینن پیدا کرے گا۔"

ہمارے موضوع کے لئے اس اقتباس سے جو کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اسلام کی صداقتوں کو دنیا پر واضح کرنے کے لئے ہم سے بہت ہی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اور وہ کوتاہیاں یہ ہیں کہ ہم نے قرآن خالص کو کسی جگہ بھی پیش نہیں کیا۔ غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب روایات سے ہی دیتے رہے، جن کے وہ قائل ہی نہیں۔ وہ تو عقائد کے معاملات کو وحی (قرآن) کے لیول پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے

ن ہی وہ دستورِ حیات ہے جو زمانے کے تقاضوں پر پورا اتر سکتا ہے ۔ آسان اور مدلل ہے ۔ کوئی تضاد
س ۔ اپنا مفہوم آپ ہی بیان کر دیتا ہے ۔ سمجھنے کے لئے کسی خاص سہارے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔
ن وہ مقناطیس ہے جس نے حضرت عمرؓ جیسے مردِ آہن کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر ساری عمر جب نا
تاب اللہ ہی کا پیغام ملت کو دیتے رہے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہی کتاب اگر لینن کو بھی پیش کی
تی تو وہ اس کی انقلابی تاثیر سے کیسے محروم رہ سکتا تھا ۔ سیٹھی صاحب ایک لینن کی بات کرتے ہیں ۔ اگر
آج ہم ضابطۂ خداوندی (قرآن) کی طرف پلٹ آئیں، تو ہمارا بچہ بچہ خدا پرست لینن بن سکتا ہے ۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی قرآن کے پیغام کو بنی نوعِ انسان تک پہنچانے کی جو امتِ مسلمہ کے ذمہ ہے اور
کسی کی مرضی کا کوئی سوال نہیں ۔ یہ تو ہوئی پیغام کی اہمیت ۔ اب اگر ایسے اہم پیغام میں اس کی اصلی شکل و صورت
(الفاظ و مفہوم) کے بجائے اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی، اضافہ یا سنی سنائی باتیں بھی شامل کر لی جائیں تو یہ
جرمِ امانت میں خیانت ہے اور اللہ کی عدالت میں ایک ناقابلِ معافی جرم ۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ
جرم تمام عالمِ اسلام میں نہ صرف کیا جاتا ہے بلکہ بار بار دہرایا بھی جاتا ہے ۔ احادیث قرآن کے ساتھ قرآن
ن مثل بنا دی گئیں ۔ فقہ کے احکام غیر متبدل اور قرآن کے ناسخ بن گئے ۔ ابھی ایک تیسرے محاذ کا ذکر باقی ہے
جسے تصوف کے نام سے پکارتے ہیں ۔ ظاہری تقدس اور اندھی عقیدت سے قطع نظر اندرونِ خانہ یہاں
بھی ایک نرالی دنیا سے واسطہ پڑتا ہے ۔ تصوف قرآن کے ظاہری احکام کو نظر انداز کرکے باطنی مفہوم پیدا کر
دیتا ہے ۔ اور اس قسم کا باطنی مفہوم پیدا کرنا بقول علامہ اقبالؒ اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے ۔ مثال کے طور پر
اسلام افلاس کو بُرا اور خدا کا عذاب سمجھتا ہے ۔ لیکن صوفیائے کرام غربت کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتے ہیں ۔
اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے لیکن تصوف جہاد اسلامی کی تردید کر دیتا
ہے ۔ صوفی حضرات ولی کا مرتبہ نبی اور رسول سے اگر بلند نہیں تو برابر ضرور سمجھتے ہیں ۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیں
کہ اس قسم کی تعلیم کے مطابق اگر ہم یورپین اقوام یا روس کو اسلام کی دعوت دیں تو وہ قائل ہونے کی بجائے الٹا
متنفر نہ ہوں تو اور کیا کریں ۔ ایران کے ایک انقلابی راہنما اور شیعہ فرقہ کے امام خمینی نے ۴ فروری ۱۹۸۹ء کو
روس کے سربراہ کو دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا ۔ روزنامہ جنگ کی ۷ فروری ۱۹۸۹ء کی اشاعت
کے بحث و نظر کے کالم میں اس خط پر جناب ثاقب نقوی نے ایک تجزیہ تحریر کیا ۔ خط کا پورا متن تو معلوم نہیں
ہو سکا ۔ البتہ تجزیہ نگار نے خط کے چیدہ چیدہ اقتباسات ضرور تحریر کئے ہیں ۔ چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔
امام خمینی مرحوم جناب گورباچوف کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں ۔

در آخر میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ ایران جو کہ عالمِ اسلام کا طاقتور ترین اور عظیم ترین

محور ہے۔ بڑی آسانی سے آپ کے نظام میں عقیدے کے خلاء کو پُر کر سکتا ہے۔"
اور وہ خلا کس طرح پُر ہو گا تجزیہ نگار خود ہی تحریر کرتا ہے :۔
" فلسفے سے بڑھ کر امام خمینی نے اپنے مکتوب میں اسلام کے عرفانی پہلو کی طرف بھی جناب گوربا چوف کی توجہ دلائی ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلام کے عرفانی پہلو کو سمجھنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔
امام خمینی لکھتے ہیں :۔

" اس سے زیادہ آپ کا وقت نہیں لینا چاہتا اور عارفوں کی کتابوں خصوصاً محی الدین ابن عربی کا ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اگر آپ چاہیں کہ اس عظیم شخصیت کے دلائل ہوں تو چند ایک دانشوروں کو جو اس قسم کے مسائل میں مہارت رکھتے ہیں قم بھیج دیجئے تاکہ چند سال کے بعد خداوند تعالےٰ کے فضل وکرم سے نازک سے نازک تر نکات اور گہرے رموز سے آگاہ ہو جائیں کیونکہ بغیر یہاں آئے یہ کام ممکن نہیں۔"

امام خمینی کے اس اقتباس کو ملحوظ رکھتے ہوئے تجزیہ نگار لکھتا ہے :

"یاد رہے کہ یہ بات ان سے کہی جا رہی ہے جنہیں اپنے فلسفے اور فلسفیانہ موشگافیوں پر ناز ہے۔ گویا ان پر یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اسلامی فلسفہ اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ اشتراکیت کے ماہر فلسفیوں کو مسلمان فلاسفہ کے سامنے کئی سال تک زانوئے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں محی الدین ابن عربی کا خصوصی ذکر توجہ طلب ہے۔ محی الدین ابن عربی کی کتاب "فصوص الحکم" کے بارے میں امام خمینی کے مایہ ناز شاگرد استاد شہید مطہری لکھتے ہیں کہ شاید کسی زمانے میں بھی دو تین آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں ہوئے جو اس کا متن سمجھ سکیں" (سیر و سلوک ص ۷۶-۷۵)

بقول تجزیہ نگار امام خمینی کے خط کی چند اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) امام خمینی نے یہ خط خود اپنے ہاتھ سے لکھا۔
(۲) مذکورہ خط تین رکنی ایک وفد لے کر روسی صدر کے پاس گیا۔
(۳) یہ خط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اور غیر مسلم حکمرانوں کے نام خط کا یہ انداز بالکل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط سے ملتا جلتا ہے۔

امام صاحب کے مکتوب پر تجزیہ تو کافی طول طویل ہے۔ بہر حال اس تفصیل اور اقتباسات سے جو کچھ میں نے اخذ کرنا تھا وہ یہ ہے کہ خط کے بقیہ متن کا تو پتہ نہیں البتہ امام خمینی کے خط کے جتنے بھی چیدہ چیدہ اقتباسات تجزیہ نگار نے تحریر کئے ہیں۔ کسی ایک میں بھی قرآن کا ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو محی الدین ابن عربی جیسے عارفوں اور

ان کی کتابوں خاص طور پر فصوص الحکم کا اور یہ بھی کہ محی الدین ابن عربی کی تعلیم اور ان کی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ شاید کسی زمانے میں بھی دو تین آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں جو اس کے متن کو سمجھ سکیں۔ گویا یہ بھی کسی کتاب کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے کہ سوائے چند ایک کے وہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ اسلام ایسے ہی صوفیوں اور عارفوں کے ذریعے پھیلا ہے تو پھر اعتراض کس بات کا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر غیر از قرآن جو بھی تعلیم بنی نوعِ انسان تک پہنچے گی۔ وہ اسلام نہیں ہوگا۔ اسلام کو بدنام اور مسخ کرنے والی بات ہوگی۔ دوسرے یہ کہ فرض کیا اس طرح ہم تمام بنی نوعِ انسان کو مسلمان بنا بھی لیتے ہیں تو پھر بھی یہ اسلام کی کوئی خدمت نہیں اور نہ ہی شکست خوردہ افراد کا ایسا ریوڑ بنی نوعِ انسان کے کسی کام آسکتا ہے۔ البتہ ہزاروں کے مقابلہ میں تین سو تیرہ ہی اسلام کے کام آتے رہے ہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام اس وقت یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو پہلے مسلمان بنایا جائے اور پھر دیگر اقوام کی طرف توجہ دی جائے۔ دراصل کسی ملک میں تمکّن حاصل کرنا مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ (نوعِ انسانی کی نشوونما کا اہتمام) کا قیام ہے۔ رسولؐ کا فریضہ تھا کہ وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا، جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا جنہیں قرآن نے ناپسند ٹھہرایا ہے۔ رسولؐ کے بعد اب یہی فریضہ ہمارا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"تم بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔" (۳ : ۱۰۹)

یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے (۳۳ : ۳۵)۔ اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تم رسولؐ کی زندگی کو اپنے لئے بہترین نمونہ بناؤ۔ وہ خیر البشرؐ جو اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ اسی کے نقشِ قدم پر ہم فریضۂ رسالت ادا کر سکتے ہیں۔ کام کٹھن ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ان مشکل حالات کا مقابلہ آخر ہمارے رسولؐ نے بھی کیا ہی تھا۔

اگر ہم حضورؐ کی سنّت کے شیدائی ہیں تو بنی نوعِ انسان کی فلاح اور خود اپنی ذات کے لئے یہ فریضہ ہمیں بہر حال ادا کرنا ہوگا اور ایک مسلمان بننے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

محمد ارشاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمانی وحدت اور یہود و نصاریٰ

انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے خطبات جمعہ، ۱۳۱ کے تحت سورۃ المائدہ کی آیات ۷۱ - ۶۷ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کی گئی۔ اب آپ آیت ۶۹ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۵/۶۹)

"جو لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے اور عمل نیک کریں گے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا ستارہ پرست یا عیسائی اُن کو قیامت کے دن نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔"

اس کے چار سال بعد مولانا کوثر نیازی صاحب نے ۱۴ جولائی ۱۹۹۰ء کو گویا انٹرنیشنل یونیورسٹی کی تبلیغ کی حمایت کردی: "اسلام اور عیسائیت تاریخ کے دوراہے پر" کے عنوان کے تحت انہوں نے ان ہی خیالات کی بھرپور تائید کردی ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

بنی نوعِ انسان نے جامد نظریوں۔ انفرادیت اور مادیت پر مبنی لادینیت۔ اشتراکیت۔ قومیت اور سرمایہ داری کے اصولوں کے بہت تجربے کئے ہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے اب موقع ہے کہ وہ عظیم مذاہب کی عظیم اخلاقی اور اعتباری اقدار اور انصاف۔ مساوات۔ ترحم۔ امن۔ ہم آہنگی، اخلاقی اور مادی بہبود اور ترقی اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کے طرزِ زندگی کے احترام پر مبنی حیاتِ انسانی کے ایک جامع نظریے پر دنیا کی تشکیل نو کریں۔"

میں آیات کی غلط تعبیر و تفسیر کی طرف بعد میں آؤں گا پہلے میں جناب کوثر نیازی صاحب سے چند سوالات کرتا ہوں

آیات میں یہود کا تذکرہ بھی موجود ہے اور آپ صرف عیسائی حضرات کو تعاون اور تشکیل نو کی دعوت تک محدود کر رہے ہیں۔ یہاں یہود کا کونسا بڑا جرم ہے کہ آپ ان کو آیات میں شامل کئے جانے کے باوجود خارج کر رہے ہیں۔

۲ آپ نے احترام پر مبنی حیاتِ انسانی کا تذکرہ کیا ہے۔ کیا سلمان رشدی پر احترام کی خلاف ورزی کے تحفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پہلے آپ دنیائے عیسائیت کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ سلمان رشدی کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گستاخ ہے تو وہ سب کے جدِ اعلیٰ تھے وہ اس عدم احترام میں کیوں الگ کھڑے ہیں۔

۳ کیا عیسائی حضرات عیسائیت کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی ایک بڑا مذہب مان کر عدالتی احترام واحتساب میں برابر کا درجہ دینے پر تیار ہیں۔

۴ پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ ؐ کا نفاذ۔ نفاذِ شریعت۔ شریعت بل وغیرہ مباحث آپ سے پوشیدہ نہیں یعنی ہم خود اسلام کو نافذ نہیں کر رہے ہیں اور عیسائی حضرات تو انجیلِ مقدس کو ایک طرف رکھ کر محض عقلِ انسانی کے بل بوتے پر تجرباتی جمہوریت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کے ہاں ذریعۂ علم صرف عقلی تجربات ہیں۔

۵ اگر انجیلِ مقدس عقلی تجربات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہم بھی نفاذِ اسلام میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے تو یہ مذہبی اتحاد بڑا عجیب سا ہوگا۔ کیا ہم انجیلِ مقدس پر عمل کریں اور وہ قرآن پر یا بات کیا بنے گی؟
علامہ اقبال ؒ نے اس گتھی کو یوں سلجھایا تھا

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم

...ں بات یہ ہے کہ عیسائی دنیا انجیلِ مقدس کو بالکل ترک کر چکی ہے انہوں نے جمہوری عقلی تجربات سے اقوامِ متحدہ ...ی ہے۔ اس عقلی تجربے میں تمام وہ اقوام بھی شامل ہو گئی ہیں جو کسی مذہب کو مانتی ہیں یا نہیں اور زبردست مسلمان ...بھی اس رو میں بہہ کر اقوامِ متحدہ میں شامل ہو چکی ہیں۔ آج اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی کاروائی یہ عملی طور پر تسلیم کرتی ہے ...م کا ذریعہ صرف عقلی تجربات ہیں۔ وہ علمِ وحی کو ذریعۂ علم کے طور پر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ لہٰذا علمِ وحی کو ذریعۂ علم ...ننے والوں کا عالمی مرکز بیت اللہ شریف ہونا چاہیئے۔ یوں وحدتِ آدم بنے گی جس کو آپ تشکیلِ نو کہتے ہیں۔
...ں کے متعلق جناب علامہ اقبال ؒ بہت عرصہ پہلے کہہ گئے تھے۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اس کا حل ہے ایک کتاب ۔ایک مرکز اور ایک امّت ۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

اب آپ زیرِ بحث آیت کی طرف آیئے اس میں صرف " مَنْ اٰمَنَ " کا تصوّر ہی ساری بات صاف کر دیتا ہے ۔یعنی یہودی ۔صابی ۔نصاریٰ سے جو کوئی بھی ایمان لائے گا جب تک ایمان لا کر اس حلقۂ ایمان میں داخل نہیں ہوگا۔اس کا عمل صالح شمار ہی نہیں ہو سکتا ۔

اب میں اس بارے میں دیگر مفسّرین حضرات کے اقتباس پیش کرتا ہوں ـــــــ تفسیر بیان القرآن میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"جو مسلمان ہو جاوے گا مستحق اجر و نجاتِ اخروی ہوگا" (عکسی ترجمہ و تفسیر ص۹)

محترم غلام احمد پرویز صاحب نے مطالب الفرقان جلد اوّل ص۸۳ میں لکھا ہے ۔

"جو یہودی یا نصاریٰ یا صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا"

اب اللہ پر نبی اکرمؐ کے ایمان کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے!

۱۔ وَ اتَّبِعْ مَا يُوحٰىٓ اِلَيْكَ ۔ (۱۰/۱۰۹)

۲۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰىٓ اِلَيَّ (۶/۵۰)

۳۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۵/۵۲)

۴۔ وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ (۲۳/۷۱)

۵۔ اور قرآن کی مثل کوئی نہیں لا سکتا ۔ (۲/۲۳ - ۱۷/۸۸)

تعزیّت

محترم صوفی محمد نذیر احمد صاحب کی اہلیہ محترمہ ۲۸ ،مارچ ۱۹۹۱ء ،بروز جمعرات وفات پا گئیں ۔وابستگانِ فکرِ قرآنی صوفی صاحب کے غم میں برابر کے شریک ہیں ۔اللہ مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کا درسِ قرآن کریم

درج ذیل مقامات پر ہوتا ہے!

شہر	مقام	دن	وقت
لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ نمبر ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹ : ۳۰ بجے صبح
چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	〃	۳ بجے بعد نمازِ جمعہ
پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق۔ نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ / جمعہ	۴ بجے شام
کوئٹہ	۱۶۶ / ڈی جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	〃	۱۰ بجے صبح
کراچی	۲۲۸، شرف آباد، رابطہ محترم خالد گل، فون ۵۴۷۳۲۹ ۵۸۲۲۵۱	〃	۹ : ۳۰ بجے صبح
〃	کورنگی، رابطہ محترم محمد سرور: فون ۳۱۲۶۳۱	〃	۱۱ : ۰۰ بجے صبح
〃	کھڈا مارکیٹ، رابطہ جمعہ بھائی، فون ۷۴۲۰۳۸	〃	۱۱ : ۰۰ بجے صبح
〃	جمعہ بھائی۔ نیو کلری۔ منگورہ آباد۔ گلی ۱۳۔ بی		
〃	لیاری کراچی۔ فون : ۷۴۲۰۳۸		
پیر محل	مکان ۱۴۰ / ۱۳۹۔ مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ بجے صبح
گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نمازِ جمعہ
سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز۔ ریلوے روڈ	〃	۹ بجے صبح
سید حسن	برمکان محترم سید محمد حسین	〃	۲ بجے شام
جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد۔ جی۔ ٹی۔ روڈ	〃	۶ بجے شام
پنج کستی	برمطب حکیم احمد دین	〃	۳ بجے سہ پہر
چک ۲۱۵ ای بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	〃	۸ بجے صبح

	شہر	مقام	دن	وقت
۱۸	ایبٹ آباد	۲۳۴۔ کے ایل کیہال	جمعۃ المبارک	۱۰ بجے صبح
۱۹	برمنگھم یوکے	229 ALUM ROCK ROAD BIRMINGHAM	اتوار	۳ بجے سہ پہر
۲۰	ٹورنٹو	716 THE WEST MALL 1904 ETOBICOKE	ہر ماہ پہلا اتوار	۱۱ بجے صبح
۲۱	اوسلو (ناروے)	TORG GATA 26-28-OSLO-1	ہر ماہ پہلا اتوار	۴ بجے شام
۲۲	ڈنمارک	GL KONGEVEJ 47, 3TH DK 1610 KBH V	ہر ماہ آخری ہفتہ	۲ بجے سہ پہر
۲۳	حیدر آباد	گولڈن سینٹری۔ عثمان آباد	جمعۃ المبارک	۵ بجے شام
۲۴	لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	〃	بعد نماز مغرب
۲۵	لندن	PARK RD ILFORD ESSEX TEL 081-553-1896	ہر ماہ پہلا اتوار	۲:۳۰ بجے سہ پہر
۲۶	گوجرانوالہ	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی ۵	ہر ماہ پہلا، تیسرا جمعہ	۹ بجے صبح
۲۷	رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ بجے
۲۸	گجرات	مرزا ہسپتال۔ کچہری روڈ	جمعرات	۳ بجے سہ پہر
۲۹	جلال پور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	〃	۱۰ بجے صبح
۳۰	فیصل آباد	۲۲۳۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک: فون ۲۸۵۵۴	بروز جمعہ	۳:۳۰ بجے سہ پہر
۳۱		کارخانہ نٹ سازی گلی ۱۳ محلہ فیض آباد رابطہ فون: ۲۲۸۵۴ مرزا محمد صدیق	سوموار	۴ بجے سہ پہر
۳۲	پشاور	برمکان ڈاکٹر طلبشیر الحق، افغان کالونی	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۳۳	راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم۔ ۳۰ مکھا سنگھ سٹیٹ نزد کمیٹی چوک	〃	۳:۳۰ بجے شام

عبداللہ ثانی پشاور

میں وصیّت کرنا چاہتا ہوں، لیکن.....؟

قرآنِ کریم نے وصیّت پر کسی قسم کی پابندی عاید نہیں کی بلکہ اسے فرض قرار دیا ہے۔ لیکن محمڈن لاء کی دفعہ ۱۱۷ اور ۱۱۸ کے تحت کوئی مسلمان اپنی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد میں ۱/۳ سے زاید وصیّت نہیں کرسکتا۔ نیز وارثوں کے حق میں بھی وصیّت نہیں کرسکتا۔ (یاد رہے محمڈن لاء کی تدوین ایک غیر مسلم نے کی ہے) اس پابندی کو راقم نے دفاعی شرعی عدالت میں چیلنج کیا ہے کہ یہ پابندی احکاماتِ قرآنی کے یکسر خلاف ہے اس پابندی کو ختم کیا جائے۔ درخواست ابتدائی سماعت کے بعد باقاعدہ سماعت کے لئے منظور ہوئی جس میں ۲۶ مارچ ۱۹۹۱ء برائے بحث مقرر تھی۔ عدالت جناب جسٹس عبادت یار خان۔ جناب جسٹس علامہ ڈاکٹر فدا محمد خان۔ جناب جسٹس عبدالرزاق۔ اے تہیم۔ جناب جسٹس عبیداللہ خان پر مشتمل تھی۔

راقم کی معاونت جناب صاحبزادہ سکندر اعظم اور اخونزادہ عبدالمنان ایڈووکیٹس نے کی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید فاضل عدالت دائرہ اختیار (JUYISDICTION) پر ہمیں بحث کا موقع دے گی۔ اس لئے دائرۂ اختیار پر تحریری بحث ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے قبل کہ تحریری بحث آپ پڑھیں، مناسب ہوگا کہ ان آئینی پابندیوں کا بھی ذکر ہوجائے جو آئینِ پاکستان نے عدالت ہائے عالیہ پر لگائی ہیں اور جس کی وجہ سے فاضل عدالتیں بعض درخواستیں نہیں سُن سکتیں۔

آئینِ پاکستان نے دفاقی شرعی عدالت کے اختیارات محدود کر دیئے ہیں۔ آئین کی تینوں دفعات پڑھنے کے بعد قارئین کسی نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی محسوس کریں گے۔

2-A :- THE OBJECTIVES RESOLUTION TO FORM PART OF SUBSTANTION

PROVISIONS :- THE PRINCIPLES AND PROVISIONS SET OUT IN THE OBJECTIVES RESOLUTION REPRODUCED IN

THE ANNEX ARE HEREBY MADE SUBSTANTIVE PART OF THE CONSTITUTION AND SHALL HAVE EFFECT ACCORDINGLY

203-C :- "LAW" INCLUDES ANY CUSTOM OR USAGE HAVING THE FORCE OF LAW BUT DOES NOT INCLUDE THE CONSTITUTION, MUSLIM PERSNAL LAW, ANYLAW RELATING TO THE PROCEDURE OF ANY COURT OR TRIBUNAL OR, ...

227 :- PROVISIONS RELATING TO THE HOLY QURAN AND SUNNAH '- ALL EXISTING LAWS SHALL BE BROUGHT IN CONFORMITY WITH THE INJUNCTIONS OF ISLAM AS LAID DOWN IN THE HOLY QURAN AND SUNNAH.

(IN THE APPLICATION OF THIS CLAUSE TO THE PERSONAL LAW OF ANY MUSLIM SECT THE EXPRESSION "QURAN AND SUNNAH" SHALL MEAN THE QURAN AND SUNNHA AS INTERPRETED BY THAT SECT)

سائل نے عدالت کے دائرۂ اختیار (JURISDICTION) پر جو تحریری دلائل دیئے اور جسے شاملِ ریکارڈ کر دیا گیا۔ کچھ یوں تھے۔ ابتدائی پیراگراف زبانی تھا۔

عالی جاہ! جیسا کہ میں نے آئین کی تینوں دفعات آپ کے سامنے پڑھیں۔ آپ نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ ان تینوں دفعات میں باہمی اختلاف موجود ہے اور جس کے نتیجے میں عدالت حضور کے اختیار کو محدود کر دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آئین انسانوں نے بنایا ہے اس لئے اس میں اختلاف کا ہونا یقینی امر ہے۔ جس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ

اِخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ۵ (۴/۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔ انسانی جذبات کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ ابھی کچھ کہتے ہیں، ابھی کچھ، دن کو کچھ کرتے ہیں، رات کو کچھ۔ زبان پر کچھ ہوتا ہے، دل میں کچھ، لیکن خدا کا ضابطۂ قوانین (قرآن) ہے کہ اس میں، کہیں کوئی بات ایک دوسرے کے خلاف نہیں ملے گی۔ یہاں سے وہاں تک ایک ہی حقیقت ہے جسے مختلف پہلوؤں سے سامنے لایا گیا ہے۔ اگر یہ خدا کی بجائے کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔"

جناب عالی! آپ نے غور فرمایا کہ انسانی قوانین جو دراصل من عند غیر اللہ ہیں کس قدر اختلافات کے شکار ہوتے ہیں جو آپ کے سامنے ہے۔ پھر قرآن اور سنّت کی تشریح کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا گیا ہے۔

تحریری :-

جناب عالی! درخواست پیشِ نظر جب ابتدائی سماعت کیلئے عدالت حضور میں پیش ہوئی تھی تو اس وقت بھی سب سے پہلا نکتہ یہی اٹھایا گیا تھا کہ آیا ملک کے انسانوں کے ہاتھوں وضع کردہ آئین کے تحت مسلم پرسنل لاء کو چیلنج کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ابتدائی سماعت میں اس پر سیر حاصل بحث کے بعد درخواست کو منظور کرتے ہوئے حکومت کے نام نوٹس جاری کر دیا گیا تھا۔

چونکہ یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک طرف انسانی وضع کردہ آئین ہے اور دوسری طرف خداوندکریم کی طرف سے بھیجا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے انتخاب یقیناً مشکل ہے لیکن یہ بھی مدِنظر رہے کہ اس عارضی دنیا کے بعد ایک مستقل دنیا میں ہم ہی نے جانا ہے۔ جہاں اس تقابل کی باز پرس یقینی ہے۔ لہٰذا عارضی دنیا کا عارضی آئین اور جس میں خود دوسرے آمدہ انسان ۲/۳ اکثریت سے ترمیم بھی کر سکتے ہیں کے احکامات قرآن کریم پر نہیں لگائے جا سکتے اور نہ ہی قرآن کریم کو آئین کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔
اس لئے اس نکتے پر مزید وضاحت کیلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ عرض کروں۔

دراصل مسلم پرسنل لاء بھی (مختلف فقہیں) انسانوں کا وضع کردہ ہے اور آئینِ پاکستان بھی انسانوں کا وضع کردہ ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ ان تین قوانین یعنی آئین، مسلم پرسنل لاء اور قرآنِ کریم میں SUPERMACY (برتری) کس قانون کی ہوگی؟

جناب عالی! آپ کے سامنے میری درخواست برائے اصلاحِ قانونِ وصیت پڑی ہے جس میں صرف اس حد

تک اصلاح کی ضرورت ہے کہ قرآن کریم کے احکامات کے مطابق وصیّت فرض ہے اور اس پر کسی قسم کی کوئی قدغن موجود نہیں کہ وراثت (جائیداد کسی بھی شکل میں) میں سے ۱/۳ حصّے سے زیادہ وصیّت نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ہر انسان (مسلم) اپنے ماحول اور حالات (معروف) کے مطابق وصیّت کر سکتا ہے۔ چونکہ آپ نے دائرہ سماعت یا اختیارِ سماعت کا نکتہ اٹھایا ہے (JURISDICTION) جس کا خوف مجھے بھی لاحق تھا خوف اس لئے کہ قرآن کریم کو جس طریقے سے باندھ دیا گیا ہے اسے کھولنا اس لئے مشکل ہے کہ اس کے راستے میں قدم قدم پر انسانی قوانین حائل ہیں۔ اور پھر انسان کا وضع کردہ قانون اتنا سخت ہے کہ اس کے آگے قرآن کریم ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جس کیلئے خود قرآن کریم نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

مفہوم ——

"اور رسول کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا (انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا)"

ملک کے مقدّس آئین میں یہ پابندی لگا دی گئی ہے کہ اس کے تحت ملک میں موجود کسی بھی مسلمانوں کے شخصی قانون (MUSLIM PERSONAL LAW) کو کسی بھی عدالت میں بشمول وفاقی شرعی عدالت چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک قرآن کریم کی SUPERMACY کا تعلق ہے تو قرآن کریم کے مقابلے میں انسان کے وضع کردہ اس آئین کی کوئی حیثیت نہیں اور پھر جہاں تک احکاماتِ خداوندی (جو قرآن کریم میں موجود ہیں) کی اطاعت کا تعلق ہے تو ہماری بات تو ایک طرف خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ

قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ (۷ : ۲۰۳)

"ان سے کہو میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ملتی ہے۔"

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۲۰۴)

"یہ ضابطۂ قوانین تمام دنیا کے لئے بصائر و دلائل کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں ان کیلئے ہدایت و رحمت کا سرچشمہ۔"

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ (۲۸/۲۵)

بے شک تم پر قرآن کریم کا اتباع لازم قرار دے دیا گیا ہے وہ تمہیں پھر اس مقام پر واپس لائے گا۔"

اسی طرح کئی مقامات پر بالصّراحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا دائرہ اختیار قرآن کریم کے احکامات پر اطاعت تک

محدود کر دیا گیا ہے نہ کہ اس کے مقابلہ میں انسان کے وضع کردہ قوانین وضوابط تک پھر اگر ان دونوں قوانین کا کہیں ٹکراؤ آجائے تو انتخاب صرف اور صرف قرآن کریم ہی سے اس لئے ہوگا کہ:

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲:۴۱)

"اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی اور انہیں اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے یہ تمام نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور ایسے تمام کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا اور تمام معاملات کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔"

ان آیات کی روشنی میں آپ کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ ان تمام قوانین کو جو کسی صورت میں بھی انسان کے وضع کردہ ہیں اور جن کی وجہ سے امّتِ واحدہ خالصتاً امّتِ منتشرہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان قوانین کو قرآن کریم کے قوانین پر پرکھ کر تمام خود ساختہ قوانین کو ختم کرتے ہوئے پھر سے امّتِ واحدہ بنانے کی طرف پہلا قدم اٹھائیں۔ اس میں یہ لحاظ نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ قانون مسلم پرسنل لاء ہے یا مسلم نان پرسنل لاء۔ اسی لئے قرآن کریم نے اپنے احکامات کے مقابل دوسرے احکامات پر عمل درآمد کو شرک قرار دیا ہے جسے بہت بڑا جرم کہا گیا ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (۱۲:۴۰، ۱۱۱:۱۷)

"یاد رکھو! اختیارات واقتدارات کا واحد مالک اللہ ہے"

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸:۲۶-۱۱۰:۱۸)

"اُس اللہ کے قانون کے ساتھ یا حکم کے ساتھ کسی اور کا قانون یا حکم شریک نہیں کیا جا سکتا۔"

اگر یہی صورتِ حال رہی اور ہم شرک کسی بھی صورت میں کرتے رہے تو اس کے نتیجہ میں:

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۔ (۲۲:۱۷)

"اس کے ساتھ کسی اور کے اقتدار کو شامل نہ کرو ورنہ تم مصافِ زندگی میں دھتکارے ہوئے انسانوں کی طرح ذلّت وخواری کے ساتھ دوسروں سے پیچھے رہ جاؤ گے۔"

جنابِ عالی! جہاں تک مسلم پرسنل لاء کا تعلق ہے تو میں پوری جرأت کے ساتھ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا پرسنل لاء قرآنِ کریم ہے جسے آئینِ پاکستان میں درست طور پر اپنا مقام دے دیا گیا ہے کہ اسے

دنیا کی کسی عدالت میں بالعموم اور پاکستان کی کسی عدالت میں بالخصوص چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہی بات فقہوں کی یا ان سے ملتے جلتے قوانین کی تو قرآنِ کریم کی نظر میں وہ سرے سے قوانین ہی نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف فرقوں نے اپنے آپ کو دوسرے فرقوں سے متمیز رکھنے کیلئے خود وضع کئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک فرقہ دوسرے فرقے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتا اور ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ کوئی بھی شخص چاہے اپنے آپ کو مسلمان یا مسلم کہے وہ کسی طور بھی کسی فرقے کے ساتھ خود کو منسلک نہیں کر سکتا کہ یہ یکسر تعلیماتِ قرآن کے خلاف ہیں مجھے ایک بار پھر یہ عرض کرنا پڑے گا کہ تمام فرقوں کے انسانی وضع کردہ قوانین کو از خود چیلنج کر کے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور والذین معہ کا دورِ ہمایونی بلحاظِ دین سامنے آجائے۔ دراصل غلطی یہی ہے کہ وہ اپنے وضع کردہ قوانین کو خداوندِ کریم کی طرف سے وضع کردہ قوانین سمجھتے ہیں۔ بناتے خود ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝

مفہوم:۔ "ان (مذہبی پیشواؤں) کا گروہ ایسا ہے جو اپنی طرف سے باتیں وضع کرتے ہیں اور پھر انہیں وحیٔ خداوندی کے ساتھ اس طرح بٹ دیتے ہیں کہ وہ دونوں مل کر ایک ہی نظر آئیں اور یوں انسانوں کی باتیں خدا کی شریعت بن جائیں جب ان سے پوچھو تو پوری دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ باتیں بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ لوگ دیدہ دانستہ خدا کے خلاف جھوٹ بولتے اور افترا پردازی کرتے ہیں مقصد اس سے یہ ہے کہ لوگوں سے اپنی باتیں منوائیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔

۷۸۔ لیکن یہ چیز دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت خدا کے قانون کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جا سکتی اس باب میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین۔ حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہو گی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے، جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے اس کے مغز تک پہنچتے ہو، ربّانی (یعنی اس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔"

ملک کے آئین کا تقدّس اپنی جگہ پر قائم دائم اور دنیاوی نظامِ مملکت کے چلانے کا ایک اعلیٰ ذریعہ ضرور ہے اور اس کا احترام ہم پر واجب ہے لیکن جب اسی آئین اور قرآنِ کریم کا تقابل آجائے تو پھر یہ آئین احترام سے ایک طرف رکھ دیا جائے گا اور خدا کے عظیم آئین کی رُو سے فیصلہ کیا جائے گا کہ وہی برحق ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربّی ہے:

• وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵: ۴۴-۴۵-۴۷)

• جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ وہ کافر ہے (ظالم ہے فاسق ہے)

رہی یہ بات کہ مسلم پرسنل لاء کو آئین کے تحت چیلنج نہیں کیا جا سکتا تو میں بھی اس کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں اور چیلنج بھی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مسلم پرسنل لاء ہے جو دراصل قرآنِ کریم ہے جس پر تمام مسلمان بالاتفاق متفق ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہُوا "لاء" ہے اور جو خالصتاً مسلمانوں کا بالکل ذاتی۔ اور شخصی نیز اجتماعی قانون ہے جہاں تک فرقوں کے اپنے وضع کردہ فقہوں کی بات ہے تو وہ کسی صورت میں بھی مسلم پرسنل لاء قرار نہیں دیئے جا سکتے وہ تو اپنے اپنے فرقوں کے اصول و قوانین ہیں اور شرک کی سینکڑوں اقسام ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کی فقہ کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اب اگر وہ ایک دوسرے کو تسلیم نہ کریں تو ہم اسے کسی صورت میں بھی مسلم پرسنل لاء نہیں کہہ سکتے۔ البتّہ انہیں مسلم پبلک لاء کہا جا سکتا ہے پھر یہ تو نام ہیں جو ہم نے خود رکھے ہیں۔ ان ناموں کو خدائی تائید ہرگز حاصل نہیں ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے "ان مقدّس ناموں" کے متعلق فرمایا ہے کہ:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۷: ۷۱)

اس نے کہا کہ تم اپنی تباہی کا انتظار کر رہے ہو اور واقع یہ ہے کہ وہ تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے (تمہاری آنکھیں کھلی ہوتیں تو اس کے آثار سامنے نظر آجاتے) جس اضطراب اور ہیجان میں تم مبتلا ہو یہ خدا کے عذاب کی علامات نہیں تو اور کیا ہیں؟ باقی رہا تمہارے اسلاف کا مسلک سو وہ قوتیں جنہیں تمہارے اسلاف نے اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان کے اقتدار و اختیار کی کوئی سند تمہارے پاس نہیں اس نے ان کی معبودیت کی کوئی سند نازل ہی نہیں کی۔ (۵۳ : ۲۳)

اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ جس تباہی سے تمہیں متنبہ کیا جا رہا ہے میں اسے جلدی سے لے آؤں سو

وہ خدا کے قانونِ مہلت کے مطابق اپنے وقت پر نمودار ہوگی۔ تم اس کیلئے انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

عالی جاہ! یہ ہیں وہ مقدّس نام اور اصطلاحات جو ہمارے اسلاف اور ہم نے وضع کر کے ان کو اپنا معبود بنا رکھا ہے کہ اس کے خلاف ہم نہ کوئی بات سُن سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی دخل دے سکتے ہیں۔ مجھے بار بار آئین کی طرف اس لئے بھی آنا پڑ رہا ہے کہ یہ ان انسانوں کا بنایا ہوا ہے جن کی اکثریت ایسے علماء کی ہیرو تھی جو ہجوم کی صورت میں اکٹھے ہو کر بھی "مسلمان کی تعریف" نہ کر سکے۔ یہاں میں ان کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا حالانکہ وہ تاریخ کا ایک حصّہ بن چکے ہیں اس کیلئے ملاحظہ فرمائیں۔ "منیر کمیشن رپورٹ۔ صـ ۲۳۴"۔

اب اگر ملک کی اس بڑی عدالت میں، میں قرآنِ کریم کو پیش نہیں کر سکتا تو پھر میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا ہم نہ صرف خود کو دھوکا دے رہے ہیں اور آیاتِ خداوندی کی تکذیب کر رہے ہیں۔ انسانی وضع کردہ قوانین کو خدا کے قوانین پر فوقیت دے کر عذابِ عظیم کو دعوت دے رہے ہیں

جنابِ عالی! قرآنِ کریم کی JURISDICTION کہیں زیادہ ہے بہ نسبت انسانی وضع کردہ قوانین کے JURISDICTION

لہٰذا آپ کو یہ درخواست آئین کو فی الحال بالائے طاق رکھ کر اللہ کے آئین کی روشنی میں سننا چاہیئے تاکہ روزِ حشر اس عظیم عدالت میں ہم سرخرو ہو سکیں۔ یہ دنیاوی عدالتیں ہیں جو یوم الدّین کے مقابلہ میں عارضی ہیں۔

میں یہ گذارشات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں تاکہ اس کی مصدقہ نقل حاصل کرنے کے بعد پس مرگ اپنی قبر میں رکھ سکوں۔ (اگرچہ کراماً کاتبین اس وقت سب کچھ ریکارڈ کر رہے ہیں) اور پھر روزِ حشر یہی چند سطور پیش کر کے کم از کم اپنے گلو خلاصی کو ممکن بنا سکوں۔

میں قرآن پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
مرے ایمان کی ضد ہے مری طرزِ مسلمانی!
ہے صدیوں سے بسیرا مسند اضداد پر میرا
مرے اعمال جامد ہیں مرے اقوال طوفانی
عجب کیا ہے مجھے میرے مقاصد ہی سے اکتا دے
مرا ذوقِ خود آرائی مرا شوقِ تن آسانی

سائل
عبداللہ ثانی۔ پشاور۔

نوٹ
آئندہ سماعت کیلئے تاریخ مقرر نہ ہو سکی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام!

○ ہم نے تیری آواز سُنی - تیری دعوت **دعوت اِلی القرآن** ہے

ہم اس آواز پر **لبیک** کہتے ہیں!

تیرے **مقصد و مسلک** کو جانا **قرآن** کی کسوٹی پر پرکھا اور **احسن** پایا!

○ ہم اس سے **متفق** ہیں

تُو نظامِ ربوبیّت کا پیامبر ہے

ہم نے تیرے پیغام کو سُنا ..... خوابیدہ تمنّائیں جاگ اٹھیں، اذہان کو جِلا ملی، ظلماتِ یاس و نا امیدی میں رہنمائی کی ایک کرن دکھائی دی۔ ہم اس کرن کی راہنمائی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں اپنی منتشر کوششوں کو مجتمع کر کے منزل کی طرف قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہم مصائب و مشکلات اور مخالفتوں کے علی الرغم آگے بڑھتے رہیں گے، تا آنکہ جس جنّت نما معاشرے کی جھلک ہماری نگہِ بصیرت نے دیکھی ہے اسے **منصۂ شہود** پر لے آئیں اور اس نظام کو جسے آج کی دنیا ناقابلِ نفاذ کہتی ہے، **برپا کر دیں**

اے قرآنی نظامِ ربوبیّت کے پیامبر! جان لے کہ

○——— "ہم اِس **انقلاب** کے نقیب ہیں" ———○

ہماری نگاہیں یہ دیکھنے کیلئے **بیتاب** ہیں کہ کب زندگی اپنی خوابِ جمود سے انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے جمال و کمال سے دنیا کو **منوّر** اور **آسودہ** کر دیتی ہے

اے قرآنی نظام!

انسان مصائب و مشکلات میں عالمِ سکرات تک پہنچ گیا ہے۔ کائنات ہمہ تن سوال ہے۔ اندھیری شب میں ستارے تیری آمد کے منتظر ہیں۔ چڑھتا ہوا سورج تجھے دیکھنے کا متمنّی ہے

آ ! اور اپنی تمام راحتوں اور برکات کیساتھ آ

آ ! کہ تیری آمد کے نقیب ہر کسی سے کہہ رہے ہیں:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸)

طلوعِ اسلام !

یہ خاموش فضا جس میں صرف خزاں زدہ پتوں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ نہیں اس انتظار میں ہے کہ تیری للکار یہاں گونجے۔ کالج اور سکول تیری آمد کے منتظر ہیں۔ بازار اور منڈیاں اپنی الجھنوں کی کشاد چاہتی ہیں، عبادت گاہیں تیری ہنگامہ خیز صدائے تکبیر سننے کے لئے بیتاب ہیں!

آ ! کہ تیرا انتظار ہے

تیری شمیمِ جانفزا کے سفر کے لئے آہستہ خرام بادِ صبا کا دوش تیار ہے یہی بادِ صبا کبھی انقلاب انگیز جھکڑ میں تبدیل ہو جائے گی۔

آ ! اور اذہان و قلوب کو تازگی بخش !

تُو نے ہماری مچلتی آرزوؤں کو دیکھا ! اب تُو ہی بتا کہ ہم کس نظم سے آگے بڑھیں، کس کس کو اور کیا کیا ساتھ لے کر چلیں !!

سراج منیر
(شیخ اللہ دتا)
بزمِ طلوعِ اسلام لوہیاں والہ
۱۹۶۰ء

ملک حنیف وجدانی

سیاسی پارٹیاں

سیاسی پارٹیوں کے وجود کو خلافِ قرآن قرار دینے کے لئے راولپنڈی سے جناب عبدالرزاق صاحب کی درخواست وفاقی شرعی عدالت میں ابھی تک زیرِ سماعت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں جناب عادل صاحب کے ۲۱ سوالات جو انہوں نے وفاقی شرعی عدالت کے سامنے پیش کئے تھے، شائع کرتے ہوئے قارئینِ طلوعِ اسلام کو دعوتِ فکر دی تھی، جس کے جواب میں مری سے ملک حنیف وجدانی صاحب سے جوابات موصول ہوئے ہیں، جو دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے شاملِ اشاعت ہیں

یاد رکھئے!

وحدتِ اُمّت اور اس کے بعد وحدتِ انسانیت کا مدار وحدتِ قانون پر ہے اور قانونی وحدت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہو جو تمام نوعِ انسان کیلئے ضابطۂ حیات ہے!!

سوال:۔ جمہوریت اور شورائیت میں کیا فرق ہے اور یہ کہ افرادِ اُمت سے مشورہ کے بعد انبیاء متعلقہ مشورہ کے کس حد تک پابند تھے۔ نیز اس کے بعد اسلامی ریاست کے امر کا کیا کردار و پوزیشن رہی ہے؟

جواب:۔ "جمہوریت" ایک ایسا معنوی اور عملی تصور ہے۔ جس پر باقاعدہ کتاب (REPUBLIC) موجود ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تصورِ زندگی بڑھا اور پھلا پھولا جب کہ شورائیت پر کوئی باقاعدہ کتاب موجود نہیں اور نہ ہی کتاب کی ضرورت ہے۔

"شورائیت" صاحب مشورہ دینے سے عبادت ہے۔ جو کوئی بھی دے سکتا ہے لیکن اس کا ایک خاص معیار ہوگا۔ مثلاً فنونِ حرب کے متعلق ایک بدو کوئی صائب مشورہ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ جنگ خندق میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر عمل کیا گیا کیونکہ اس بارے میں اہلِ عرب ناواقف تھے۔

اب ہم جمہوریت اور شورائیت کا فرق تفصیل سے سامنے لاتے ہیں۔

مشہور زمانہ یونانی حکیم افلاطون (PLATO) اپنی کتابت ریاست (RERUBLIC) میں تین طبقات کا ذکر کرتا ہے۔ ارباب حکومت، سپاہی اور عوام۔ جبکہ یونان کا ہی دوسرا حکیم ارسطو (ARISTOTLE) بھی اپنی کتاب (POLITICS) میں تین طبقات کا ذکر کرتا ہے۔ ارباب دانش، طالب علم اور غلام ان دونوں میں جمہوریت اور شورائیت کی روح موجود ہے لیکن طبقاتی تقسیم دونوں کو بے اثر کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں موجودہ جمہوریت کا کوئی زیادہ چرچا نہ ہو سکا۔ البتہ حکمران اپنے ساتھ مجلس مشاورت (نظریہ ضرورت) کی تائید میں رکھنے پر قادر رہے اور اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

بالکل اسی طرح ہمیں ہندو معاشرہ میں بھی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر نظر آتے ہیں۔

گویا ابتدائی زمانہ میں جمہوریت کا تصور دینا یا اس پر کچھ عمل کرنا اور علمی طور پر بات آگے بڑھانا اہلِ یونان کا منفرد اعزاز ہے جو اقوامِ عالم میں اور کسی کو حاصل نہیں۔

جمہوریت کا یہ نظریہ ترقی کرتے کرتے عصرِ حاضر تک پہنچا اور اس باب میں اہلِ علم نے بڑا کام کیا ہے لیکن ہر جگہ استحصالی طبقات، کمزور طبقات کو جمہوریت کے نام پر اپنے ساتھ ملاتے ہیں۔ ان سے دل خوش کن وعدے کرتے ہیں اور یوں اپنا اقتدار قائم رکھتے ہیں۔ جمہوریت میں پارٹی بازی یا تفرقہ ایک ایسی ناقابلِ تسخیر گھاٹی ہے جو کم علم معاشرہ میں پارٹی بازی کو دشمنی کی حد تک پہنچاتی ہے اور اس سے خون خرابہ ہوتا ہے۔ جمہوریت کے لئے جو قوتِ برداشت یا حوصلہ درکار تھا اس کی مناسب تربیت بھی نہیں کی جا سکی۔ پھر جہاں مذہب اور پارٹی جمہوریت اکٹھے ہو جائیں وہاں اخلاق اور سرمایہ کا جو

دیوالیہ ہوتا ہے اس میں پاکستان بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اہلِ مغرب جمہوریت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور وہ بتدریج اس کو اصلاح سے نافذ کر رہے ہیں کیونکہ وہ علم اور فکرِ انسانی کے قائل ہیں۔ علمِ وحی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

"مغربی ممالک میں اس وقت تک کی ڈیماکریسی کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ڈیماکریسی کی سیاسی مشنری نصب ہو چکی ہے اور لوگ اس سے مطمئن ہیں"۔

انسان نے کیا سوچا۔ ص ۲۲۸،
از علامہ غلام احمد پرویزؒ

۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کی طرف سے انسانی بنیادی حقوق کا چارٹر شائع کیا گیا۔ اب تمام اقوامِ عالم اپنی جمہوریت یا آمریت میں ان حقوق کی پاسبانی کا وعدہ کرتی رہتی ہیں لیکن جمہوریت ہو یا آمریت ہر جگہ استحصالی طبقات ان حقوق کے آڑے آ رہے ہیں اور نوعِ انسان آج تک جمہوریت کے سراب آسا خوش کن نظریات کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔

بہرحال جمہوریت، شورائیت کے لئے نمائندے سامنے لاتی ہے لیکن ان میں طبقاتی اثر غالب ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نمائندے کچلے ہوئے کمزور طبقات اور خاص کر اقلیت والوں کے دکھوں کا مداوہ نہیں بن سکتے۔

اب ہم شورائیت کے اس تصور کی طرف آتے ہیں جنہیں حضرات انبیائے کرامؑ سے منسوب کیا گیا ہے۔ یعنی وہ کس حد تک مشورہ کرتے رہے اور کس حد تک اس کے پابند تھے۔

پہلے انجیل مقدس کے حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔ میں تمہیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں گا"۔

متی ۵/۱۹، (ایڈیشن ۱۹۶۰ء اگزلری بیبل سوسائٹی لاہور)

یہ بات انہوں نے مچھیروں سے کہی تھی اور ان کو تربیت دے کر حواری بنا دیا۔ یعنی نبوت میں پہلے تربیت ہے اور پھر شورائیت کا مقام۔

"میں راست بازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں"۔ (متی ۹/۱۳)

یہاں بھی گنہگاروں کو بلانے کا مقصد ان کی تربیت کر کے اپنا اور راست باز بنانا ہے۔ اگر ایسے لوگ بعد میں شورائیت پر پورے اُتریں تو اُتر سکتے ہیں کیونکہ وہ تربیت یافتہ ہیں۔

"اگر کوئی اوّل ہونا چاہے تو وہ سب میں پچھلا اور سب کا خادم بنے"۔ (مرقس ۹/۳۵)

اس سے آپ اندازہ فرمالیں کہ اوّلیت کس طرح خدمت سے وابستہ کر دی گئی ہے اور اس پر بھی غور فرمایئے کہ " سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ " جناب مسیحؑ کس طرح خدمت سے عظمت کی طرف لے جا رہے ہیں اور جہاں خدمت اور عظمت اکٹھے ہوں وہاں مشاورت بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ خاصۂ تربیتِ نبوّت جن کو نصیب ہو سکا واقعی وہ اپنے دور کے خوش نصیب تھے۔

" جب تو ضیافت کرے تو غریبوں، لنگڑوں اور اندھوں کو بلا۔" (لوقا ۱۴/۱۳)

جب یہ کمزور طبقات کسی کے ہم نوا ہو جائیں تو ان کے دل میں اس کی قدر و منزلت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ یہ تربیت کی پہلی منزل ہے۔ یہاں سے ان میں مشاورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

" مگر یسوع نے بچوں کو پاس بُلا کر کہا کہ چھوٹے لڑکوں کو میرے پاس آنے دو اور منع نہ کرو۔" (لوقا ۱۸/۱۶)

نژادِ نو کی تربیت کا یہ نبوی طریقہ کتنا مبارک ہے۔ جو بعد میں شورائیت کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہوا۔ یعنی مذاہب میں شورائیت کم اور تربیت کا انقلابی پہلو زیادہ روشن ہوتا ہے۔ ایک شہادت ملاحظہ ہو۔

" مذاہبِ عالم کی تاریخ میں پہلا دور ہمیشہ ایک انقلاب ہوتا ہے جس میں بانیٔ مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں اور تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس زمانے کے معاشی، اقتصادی اور سماجی نظام کی ناانصافیوں اور اخلاقی و روحانی پستیوں کے خلاف ایک نئے نظام، نئے معاشرے اور نئی اخلاقی و روحانی اقدار کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس مذہب یا روحانی انقلاب کو قبول کرنے والی پہلی جماعت کی تمام قوتیں انقلاب کو عملی جامہ پہنانے پر مرکوز ہوتی ہیں۔"

(اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید، صفحہ ۱۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کس قسم کے شاگرد پیدا کئے۔

" یہ وہی شاگرد ہے جو ان باتوں کا گواہ اور لکھنے والا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی گواہی سچی ہے۔" (یوحنّا ۲۱/۲۴)

" جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق بانٹ دیا کرتے تھے۔ اور ہر روز ایک دل ہو کر ہیکل میں جمع ہوا کرتے اور گھروں میں روٹی

توڑ کر خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے۔"

(اعمال ۴۶-۴۴/۲)

شورائیت کس لئے کی جاتی ہے؟ ضروریاتِ زندگی کے لئے۔ اگر عنوانِ بالا (حوالہ) کے مطابق اس طرح ضرورت مندوں کی ضرورتیں خود بخود پوری ہو جایا کریں تو ہماری یہ شورائیت جس کی ہم نمائش کرتے ہیں آخر چہ معنی دارد؟

اب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشاورت کی طرف آتے ہیں۔

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔

جنگ بدر کا واقعہ ہے۔

"آنحضرتؐ بدر میں پہنچ کر پہلے چشمے پر اُتر پڑے تھے۔ حضرت حباب بن منذر نے پوچھا کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم ایسا ہی ہے۔ جس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں یا آپؐ نے خود جنگی تدبیر کے لحاظ سے اس مقام کو منتخب فرمایا۔ جواب دیا کہ یہ خود میری رائے ہے۔ حباب نے کہا کہ یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آگے بڑھ کر ہم قریش کی فرودگاہ کے قریب تر چشمے پر قبضہ کر لیں اور اپنے لئے حوض بھر کر اردگرد کے چشموں کو پاٹ دیں تاکہ ان کو پانی نہ مل سکے۔ حضورؐ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اسی کے مطابق عمل کیا۔"

(تاریخ الامت جلد ہشتم ص ۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے خود مشورہ لیا۔ شورائیت کی طرح ڈالی۔ جو بعد میں خلفائے راشدین میں جاری رہی۔

"حضرت ابوبکرؓ کی دو صفتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پختگیٔ عزم، رقتِ قلب۔"

پختگیٔ عزم کے یہ معنی ہیں کہ جو مہم پیش آئے اس میں جہاں تک ہو سکے غور و فکر اور تامل کرے اور دوسرے اربابِ عقل سے رائے مشورہ لے اور جب اس کا راستہ متعین ہو جائے تو اس پر چل پڑے پھر کوئی چیز اس کے بڑھنے میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ یہاں تک کہ اگر پہاڑ بھی سامنے آئے تو وہ بھی سدِ راہ نہ بن سکے۔ یہی حالت حضرت ابوبکرؓ کی تھی۔"

(تاریخ الامت، جلد ہشتم، صفحہ ۳۲-۳۳)

"انہوں نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔" (ایضاً ص ۷۸)

"الغرض بعد مشورہ یہی رائے قرار پائی کہ حضرت عمرؓ خلیفہ بنائے جائیں۔"

(ایضاً ص ۷۸)

"حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عمّالِ حکومت بلکہ خود خلیفہ بھی ایک معمولی فرد رعایا کے برابر تھا۔ ہر شخص کو اس کے اوپر نکتہ چینی کا اختیار تھا اور یہی وہ چیز ہے جو جمہوریت کی اصلی رُوح ہے۔" (ایضاً ص ۱۳۲)

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد کیا ہوا۔ اس کی جھلک کا آغاز ان کی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ زخمی حالت میں فرمایا۔

"جب مجھ کو دفن کر کے فارغ ہو جائیں تو ان چھ آدمیوں کو ایک مکان میں جمع کرنا تاکہ یہ اپنے آپ میں سے کسی امیر منتخب کر لیں۔" (ایضاً ص ۱۴۹)

یہ چھ حضرات، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

یہ روحِ جمہوریت اور شورائیت دورِ صحابہؓ کرام میں جاری رہی اور ملوکیت یا آمریت اثر نہ کر سکی بعد میں یہ روح ختم ہو گئی اور آج ہم اس گم گشتہ خوبی کو دوسروں سے ادھار لے کر اپنا رہے ہیں۔

اور خوش ہیں کہ ہم جمہوریت علم بردار ہیں۔

حالانکہ جمہوریت برائے شورائیت کی روح ہمارا عظیم ورثہ ہے۔

مسلمان

یہ لفظ استعمال کے لحاظ سے دنیا کے ہر گوشے میں، بیک وقت کروڑوں زبانوں پر ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی دو ذہن بھی اس کی متفق علیہ تعریف متعین نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس شکل میں نہیں آیا۔ اس کی جگہ اس میں مسلم کا لفظ آیا ہے جس کی جمع مسلمون اور مسلمین آتی ہے۔ معنوی لحاظ سے مسلم سے مراد ہو گی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنیوالا یعنی الاسلام کا پیرو۔ لیکن اس کا یہ مفہوم تو الدین کی رُو سے ہو گا جس میں اسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار کیا جائیگا۔ مذہب میں چونکہ خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں اس لئے مسلمان کا مفہوم کس طرح متعین ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے علمائے کرام مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف نہیں پیش کر سکتے۔ یہ علماء خود مذہبی پیشوا ہیں۔ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دین میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حقائق و عبر

حدیث "اصحابی کالنجوم" کی علمی تحقیق

ہمارے علماء حضرات بار بار دو حدیثوں کا تحریر و تقریر میں ذکر کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ امت کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف رحمت ہے اور دوسرے یہ کہ میرے صحابہ کرام آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔ تم جس کی بھی پیروی کرو گے فلاح پا جاؤ گے۔ یہ دونوں احادیث ایک ہی حدیث کا حصہ ہیں اور آئمہ حدیث نے ان دونوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ پرویز صاحبؒ نے ان دونوں احادیث کو قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیا تھا تو انہیں سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا، لیکن اب علماء کی اپنی تحقیق شروع ہوئی ہے جس کے مطابق اسماء الرجال کے تمام آئمہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ماہنامہ المجلس نے اس سلسلے میں پورے ۲۹ ائمہ حدیث کی تحقیق نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"یہاں پر ایک عرض کرنا ضروری ہے کہ جن علماء کرام کے ہم نے حدیث النجوم کے سلسلے میں نظریات پیش کئے ہیں کہ انہوں نے اس حدیث کو ضعیف باطل اور جعلی قرار دیا ہے یہ برسبیل مثال تھا ورنہ علماء کی کثیر جماعت اور بھی ہے جنہوں نے حدیث النجوم کو ضعیف قرار دیا ہے جن میں مندرجہ ذیل حضرات بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن الملقن، علامہ ابن تیمیہ، علامہ الجلال المحلی۔ علامہ ابوالنصر السجزی، علامہ ابوذرعہ الحلبی۔ علامہ احمد بن قاسم العبادی علامہ السبکی اور صاحب منہاج الاصول علامہ ابن امام الکاملیہ، مولوی نظام الدین صاحب صبح صادق فی شرح المنار۔ مولوی عبدالعلی بحر العلوم صاحب شرح مسلم الثبوت اور علماء متاخرین میں سے محمد ناصر الدین الالبانی، سید محمد بن عقیل العلوی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علماء متقدمین و متاخرین میں وہ تمام حضرات جو صحابہ کو جائز الخطاء سمجھتے ہیں اور سب کے سب صحابہ کی عدالت و عصمت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ حدیث النجوم ضعیف ہے اور قابل قبول نہیں ہے۔

حدیث، اختلاف امتی رحمت

حدیث النجوم کے سلسلے میں تحقیق کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ حدیث النجوم کی سند کے بعض طرق ایک اور حدیث یعنی حدیث اختلاف امتی رحمۃ پر مشتمل ہیں۔ محدثین میں سے بعض حضرات نے اس حدیث کو بھی ضعیف اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ اس حدیث کے سلسلے میں بھی علماء کا نظریہ پیش کیا جائے۔

۱ حافظ العراقی کہتے ہیں کہ حدیث " اختلاف امتی رحمۃ " کو بیہقی نے اپنے رسالہ " الاشعریہ " میں ذکر کیا ہے اور " المدخل " میں اس حدیث کی سند ابن عباس کی طرف دی ہے جس کو " اختلاف صحابی لکم رحمۃ " کی عبارت سے نقل کیا ہے لیکن اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ (المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار حاشیہ احیاء العلوم ۱/۳۷)

۲ حافظ محمد بن طاہر کہتے ہیں کہ علامہ حافظ سخاوی نے اپنی کتاب " المقاصد الحسنۃ " میں حدیث اختلاف امتی رحمۃ کو بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس نے ضحاک عن ابن عباس کے حوالے سے مرفوعاً ایک لمبی چوڑی حدیث کی صورت میں نقل کیا ہے جس میں " اختلاف اصحابی لکم رحمۃ کی صورت میں نقل کیا ہے، اسی طرح طبرانی اور دیلمی نے بھی نقل کیا ہے۔ ضحاک نے اسے ابن عباس سے منقطع السند نقل کیا ہے اور حافظ عراقی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(تذکرۃ الموضوعات ۹۰، ۹۱)

(ماہنامہ مجلس لاہور بابت مارچ۔اپریل ۱۹۹۱ء صفحات ۱۳، ۱۴)

فقہ حنفی اور نظام زکواۃ

فقہ حنفی کے علمبردار مولوی سمیع الحق صاحب نے اپنے ماہنامہ میں پاکستان میں شریعتِ اسلامی کے نظام کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ نظامِ زکواۃ کے بارے میں فرماتے ہیں:

" نظامِ زکواۃ اور سرکاری ٹیکسوں سے اس کا تعلق۔

زکواۃ اسلام میں فرض اور ایک اہم رکن ہے اقتصادی واجتماعی فوائد کے علاوہ یہ ایک عبادت بھی ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں زکواۃ مالداروں پر فرض ہوتی ہے جو صاحبِ نصاب ہوں۔ زکواۃ کے مصارف کو قرآن نے مخصوص افراد کیلئے اور مخصوص صورتوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

حکومت کو دوسری ضروریات اور انسانوں کی اپنی خواہشات جیسے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، بجلی اور پانی کی

سپلائی وغیرہ کے لئے اگر دوسرے ٹیکس لگائے جائیں تو ان کا فائدہ انسان خود ہی اٹھائیں گے۔ ایسی صورت میں زکوٰۃ کیسے معاف کی جاسکتی ہے۔ جو محتاجوں اور پریشان حالوں وغیرہ کا حق ہے؟"

(ماہنامہ الحق بابت مارچ ۱۹۹۱ء صـ ۴۵/۳۶۵)

مولوی سمیع الحق صاحب اور ان کے ہمنوا یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ چونکہ پاکستان میں حنفی فقہ کے پیروکاروں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج کر دیا جائے۔ یہ حقیقت شاید ان کے علم میں نہیں کہ حنفی فقہ کی ایک معتبر کتاب میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان نظامِ زکوٰۃ کے علاوہ دنیاوی ٹیکس لگانے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔ (احکام القرآن از قاضی ابوبکر جصاص جلد دوم صـ ۳۸)

سیاستدان اور ڈاکو

صوبہ سندھ میں امن و امان کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے اور اس کے نتیجے میں بعض سندھی لیڈروں کی جانب سے سندھ کی آزادی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے ملکی صحافیوں کی ایک جماعت نے صوبہ سندھ کا دورہ کیا اور منجملہ دوسری باتوں کے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ:

"حیدر آباد کا ڈی۔ آئی۔ جی (پولیس) ایسے سیاستدانوں کا نام بتا سکتا ہے جو ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کی پشت پناہی کرتے اور بوقتِ ضرورت انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال بھی کرتے ہیں"

امیر جماعت اسلامی کا نعرۂ حق

علامہ پرویز صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت دنیا میں کہیں بھی اسلامی شریعت نافذ نہیں اور یہ کہ ملوکیت اور شریعت ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ ان کے اس نقطۂ نظر کے جواب میں انہیں گالیاں دی جاتی تھیں۔ لیکن یہ ایک ایسی سچائی تھی کہ اب خود انہی علماء حضرات کو اسے تسلیم کرنا پڑا۔ جماعت اسلامی کی جانب سے ۱۵۔ مارچ ۱۹۹۱ء کو 'یومِ مذمتِ امریکہ' کے نام سے ایک ریلی کا اہتمام کیا گیا۔ جس سے خطاب

کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی نے اعلان کیا :۔

" ملوکیت اور شریعت ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں ۔
اس وقت دنیا میں کہیں بھی اسلامی شریعت نافذ نہیں ۔
"یا دستگیر یا پیر" کو شرک کہنے والے "یا بُش" کو شرک نہیں سمجھتے ؟

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۶ مارچ ۹۱ء)

علماء، ٹی۔وی اور قرآنی آیات

وطنِ عزیز میں روشن خیال علماء کی کمی نہیں لیکن ٹی وی پر جن حضرات کو بلایا جاتا ہے وہ دینِ اسلام کی ایسی صورت پیش کرتے ہیں، جن پر خود ان کے ساتھی بھی چیخ اٹھے ہیں ۔ اس پر ہفت روزہ الاعتصام کا تبصرہ، ملاحظہ ہو۔

"پاکستان ٹی۔وی آج کل جو عظیم "ثقافتی اور تہذیبی خدمات انجام دے رہا ہے وہ ایک الگ تکلیف دہ موضوع ہے مگر اس کے دینی اور مذہبی پروگراموں میں جن علمائے کرام کو اذنِ جلوہ نمائی ملتا ہے ان میں سے بیشتر قرآن کو صحیح تلفظ اور درست اعراب کے ساتھ پڑھنے کی اہلیت سے بھی عاری ہیں ۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کی جرأت و بے باکی پر کہ اس کے باوجود وہ رموز و معارفِ قرآنی پر بڑی "ماہرانہ" گفتگو فرما رہے ہوتے ہیں ۔

خاص طور پر علامہ عباس حیدر عابدی قرآنی آیات کو درست تلفظ اور اعراب کے ساتھ پڑھنے کی توفیق کم ہی پاتے ہیں ۔ مثلاً ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء کو سات بجے شام پروگرام "القرآن" میں موصوف نے اپنی گفتگو کے دوران صرف دو آیات پڑھیں اور حسنِ کمال یہ کہ ایک میں حرکات بدل کر رکھ دیں (جس سے ان کی مہارتِ نحوی کا سراغ ملتا ہے) اور دوسری میں ایک لفظ ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے ۔

سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۷۹ "مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ کو مَا كَانَ اللّٰهَ لِيَطْلِعُكُمْ پڑھا اور سورہ جن کی ۔ آیت ۲۷ "اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ کو ..... مِنْ رُسُلٍ بنا دیا ۔ پھر رات دس بجے کے بعد پروگرام اسمار الحسنیٰ

حالانکہ عنوان الاسماء الحسنیٰ ہونا چاہیئے) میں جناب ولی محمد رازی تشریف لائے اور حدیث اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ کا آخری حصّہ اس طرح پڑھا... کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ اور ارباب علم کو "نئے معانی" سے آشنا کر گئے۔ موصوف سورہ طٰہٰ کی آیت ۸۳ کی قرأت میں بھی غلطی کر گئے۔

چند روز قبل ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب کسب حلال پر گفتگو فرما رہے تھے اثنار گفتگو سورہ جمعہ کی ایک آیت یوں پڑھی۔ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ..... جب کہ بچے بھی جانتے ہیں کہ یہاں مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور قرآنی الفاظ یہ ہیں " فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ " کیا ان پروگراموں کے ذمّہ داران توجّہ فرمائیں گے ؟"

(ہفت روزہ الاعتصام بابت ۱۲۔ اپریل ۱۹۹۱ء صـ۲۷)

جہادِ افغانستان اور غلامی کی رسمِ بد کا احیاء

اسلام سے پہلے ساری دنیا میں غلامی کی رسم نے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنا رکھا تھا۔ انسان بھی منڈیوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ اسلام نے اس رسمِ بد کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا (سورہ محمدؐ) اور عرب معاشرے میں جو غلام موجود تھے مختلف طریقوں سے انہیں اسی معاشرے میں کھپا دیا گیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ آج جب کہ ساری دنیا سے غلامی ختم ہو چکی ہے۔ افغانستان میں اسلامی جہاد کے پردے میں اس رسمِ بد کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے اور یہ خبریں تواتر سے آ رہی تھیں کہ مجاہدین افغانستان نے افغانستان کے بہت سے لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا ہے۔ جس کی ابھی تک کسی نے تردید نہیں کی۔ اس کی تصدیق عوامی نیشنل پارٹی کے ایک لیڈر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

فیصل آباد ۵۔ مئی (نمائندہ خصوصی) عوامی نیشنل پارٹی فیصل آباد کے صدر ستار حیدر نے کہا ہے کہ وفاقی حکومت کو بنیاد پرست ملاؤں کے دباؤ میں نہیں آنا چاہیئے اور مجوزہ شرعی قوانین کو اسلام کے سماجی انصاف پر مبنی احکامات کی روشنی میں طے کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے یہ بات باچا خان امن کانفرنس اور پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے بعد پشاور سے واپسی پر ایک بیان میں کہی۔ انہوں نے کہا کہ بنیاد پرست ملاّں اپنے ذاتی و گروہی مفادات کی خاطر صرف انسانیت دشمنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے مابین نفاق پیدا کرنے کا باعث بھی ہیں۔ یہ ملاّں افغانستان

جنگ کو اسلام وکفر کی جنگ قرار دے کر مسلمانوں کو قتل کرا رہے ہیں۔ جب کہ ایسے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ خوست میں نہ صرف افغان مسلمانوں کے گھر بار اور دکانیں لوٹی گئیں بلکہ مالِ غنیمت کے طور پر افغانوں کو غلام بنا کر لایا گیا اور ان انوں کو منڈی لگا کر فروخت کیا گیا۔"

(روزنامہ امروز بابت ۶ مئی ۱۹۹۱ء صفحات ۴، و ۵)

جماعت اسلامی نے خوست کی فتح کو اسلام کی فتح قرار دیا تھا۔ لیکن انسانوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے کے بارے میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ کیا وہ اس جدید دور میں بھی غلامی کو جائز سمجھتی ہے؟

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اس کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس کا ایک ایک پرچہ کئی کئی افراد پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان کے علاوہ متعدد بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ

۱ طلوعِ اسلام میں اشتہار دینے سے آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے!

۱۹۹۱ کے لئے اشتہارات کے نرخ یہ ہیں

ٹائٹل کے صفحات	ایک بار کیلئے	سال بھر کے لئے
ص ۲، ص ۳ (اندرونی صفحات)	۶۰۰/- روپے	۵۰۰۰/- روپے
ص ۴ (بیرونی صفحہ)	۸۰۰/- "	۶۰۰۰/- روپے

اندرونی صفحات

پورا صفحہ	۵۰۰/- روپے	۳۰۰۰/- روپے
نصف صفحہ	۲۷۵/- "	۱۵۰۰/- روپے
چوتھائی صفحہ	۱۵۰/- "	

مذکورہ بالا شرح ایک رنگ کے اشتہار کیلئے ہے۔ اشتہار شائستہ اور معیاری ہونے چاہئیں ——— ناظم ادارہ

قرآنی تعلیم بچوں کیلئے

قاسم نوری

عیدالاضحیٰ

السّلام علیکم بچّو! اپریل کے طلوعِ اسلام میں آپ کو ہم نے عید کے بارے میں بتایا تھا کہ عید کیا ہوتی ہے اور کیوں منائی جاتی ہے۔ آج آپ کو عیدالاضحیٰ کا قرآنی مفہوم بتائیں گے ..... یہ تو آپ جانتے ہی ہیں نا کہ عیدالاضحیٰ کو "بڑی عید" قربانی والی عید (عید قربان) اور بقرعید بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دِن دنیا بھر کے مسلم مختلف جانوروں کی قربانیاں دیا کرتے ہیں۔

عزیز بچّو! پہلی بات تو یہ نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہ بڑی عید نہیں ہوتی۔ بڑی عید تو وہی ہوتی ہے جو رمضان کے بعد آتی ہے اور جس کے منانے کا حکم خود اللہ تعالےٰ نے دیا ہے اور یہ اس لئے کہ رمضان میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یہ ایسا قیمتی خزانہ ہے کہ ساری زندگی تم جو کچھ جمع کرو یہ اس سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے جو کسی محنت اور کوشش کے بغیر اللہ کی طرف سے مفت تمہیں مِل گیا ہے یہ محض اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے لہٰذا اس کے ملنے کی خوشی میں خوشیاں مناؤ (۱۰/۵۸) تو بڑی عید ہمیں عیدالفطر کو ہی سمجھنا اور کہنا چاہیئے

یہ جو عیدالاضحیٰ ہوتی ہے یہ دراصل حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد، اجتماعی طور پر لبّیک شکر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے کے

عمل کا نام ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی (SECONDARY) ہوتی ہے۔ اصل حیثیت و اہمیت حج کی ہوتی ہے اور یہ بات پچھلے سال ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ یہ "آل ورلڈ مسلم کانفرنس" ہے جس کے سالانہ اجتماع کو حج کہا جاتا ہے اور اگر ہنگامی ضروریات کے لئے مزید اجتماعات (SUB-CONVENTIONS) منعقد کئے جائیں تو انہیں عمرہ کہہ کر پکارا جائیگا"
(تبویب القرآن صفحہ 601 جلد 2)

ایک بات بڑی اہم ہے اور وہ یہ کہ حج صرف مسلمین کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر قوم، ہر نسل، ہر مذہب اور دنیا کے ہر اس شخص کے لئے ہے جو (کعبہ مکہ) جا کر دیکھنا چاہے کہ یہ امت مسلمہ نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کیا کام کر رہی ہے اور آئندہ کیا کرنا چاہتی ہے" (22/27-28)۔ یہ دعوت دنیا بھر کے انسانوں کے لئے ہے۔ جو بھی وہاں پہنچنے کی راہ پالے اس میں شرکت کر سکتا ہے" (3/96) سب کے لئے اس کے دروازے یکساں کھلے ہیں" (22/25)۔

ننھے دوستو! جس طرح قرآن کریم صرف "مسلمانوں" کی کتاب نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لئے ہے اور یہ سارے انسانوں سے مخاطب ہوتی ہے سب کو سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ اسی طرح حج سے بھی اللہ کا منشاء یہ ہے کہ دنیا بھر سے مسلم تو مسلم وہ لوگ بھی آئیں جو قرآن کی صداقتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ جب وہ حج کے موقع پر آئیں گے اور دیکھیں گے کہ اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والی جماعت کس طرح ساری دنیا کی بھلائی کے لئے سوچ رہی ہے اور سب کی سلامتی، امن و سکون اور خوشحالی کے لئے کام کر رہی ہے تو وہ خود بھی آگے بڑھیں گے اور اس طرح ایک دن اسلام

کا نظام پوری دنیا پر غالب آجائے گا۔

لوگوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں آکر دیکھیں کہ ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کیا جارہا ہے۔" (22/28)۔

صرف زیارت کرنے اور چند رسوم کی ادائیگی کا نام حج نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی رُو سے حج ہوتا ہے مکہ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے انسانوں (اقوام) کے نمائندوں کا اجتماع جہاں وہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انسانوں کی بقاء اور فلاح کے لئے سوچ سکیں اور جو فیصلہ کریں اسے ساری دنیا میں پھیلادیں تاکہ ساری دنیا اس پر عمل کرے اور بچو! یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب ہم اتنے طاقتور اور سیاسی و معاشی طور پر اتنے مضبوط ہو جائیں کہ ساری دنیا ہماری بات پر دھیان دے اور عمل کرے اور یہ تبھی ممکن ہے۔ جب ہم قرآنِ حکیم پر عمل کریں اور غور و فکر سے پڑھیں سمجھیں۔

اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو ساری دنیا کے انسانوں کے لئے بطور مرکز تجویز کیا ہے " بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کیلئے بنایا گیا " (3/95)۔ خانہ کعبہ یعنی اللہ کے اس گھر کی بنیادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اٹھائی تھیں" (2/127) "اسے نوعِ انسان کیلئے ایک مرکز پر جمع ہونے کی خاطر بنایا گیا تھا" (2/125) مقصد یہ تھا کہ انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔" (5/2)

عزیز بچو! اسلام کا مقصد دنیا بھر کے انسانوں کے اختلافات دُور کر کے انہیں عالمگیر برادری بنانا ہے۔ حج اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی حج یا کعبہ کا ذکر آیا ہے اس کی وضاحت بھی ساتھ ساتھ کردی گئی ہے کہ یہ " اَلنَّاس " یعنی سارے انسانوں کیلئے ہے۔

تو جناب حج ہوتا ہے اپنے اس عزم کی تجدید کا نام کہ ہم ساری دنیا کے انسانوں کو ایک برادری بنائیں گے اور اس طرح انسانیت کی تکمیل کریں گے۔

یہ عزم اہلِ قرآن ہر سال دہراتے ہیں اور اس پر جو سجدہ شکر ادا کیا جاتا ہے، اسے "عید الاضحیٰ" کہتے ہیں۔

قاسم نوری

قرآن نے کیا کہا

یورپ کے سائنسدان، اشیائے فطرت پر غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام کائنات میں ایک عظیم القدر، محکم اور اٹل قانون کام کر رہا ہے، جس کے مطابق خاک کے ذرّے سے لیکر بڑے بڑے اجرام سماوی تک سرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ خارجی کائنات میں اختیار و اقتدار خدا ہی کا ہے۔ لیکن جب وہ خود انسانوں کی دنیا میں پہنچے تو انہوں نے کہہ دیا کہ انسان کو خود حق حاصل ہے کہ اپنے لئے خود قانون بنائے۔ یعنی خدا کا اقتدار صرف خارجی کائنات تک محدود ہے۔ انسان کی دنیا میں اس کا اقتدار نہیں۔

ہمارے حقیقت ناشناس مولوی نے بھی یہی کہہ دیا کہ یہاں جو تمہارا جی چاہے کرلو۔ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔ وہ وہاں تم سے پوچھے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔ یعنی اس نے بھی اس کا اعتراف کرلیا کہ خدا کا اقتدار آخرت تک محدود ہوگا۔ یہاں کی دنیا میں اس کا اقتدار نہیں ہے۔

قرآن نے کہا کہ خدا کے متعلق یہ تصور یکسر باطل ہے۔

هو الذی فی السماء اله و فی الارض اله ۸۴/۴۳

"جس خدا کا اقتدار و اختیار خارجی کائنات میں ہے اس کا اقتدار و اختیار خود تمہاری ارضی زندگی میں بھی ہے۔"

اسی کا نام توحید ہے!

the same time, the Quran does not expect overnight changes. What is important at this stage is the consciousness and awareness of what is ' traditional' and what is 'Islamic'. When slowly and gradually, this awareness becomes a conviction and hence generally acceptable, the family pattern will change.

What I have attempted is only an academic exercise. We are not orientated towards scientific research. We gleefully quote and deride the western society on the breakdown of their family unit, their high percentage of divorce rate, their wayward and defiant children. But how do we know all this ? It is because that society has the grit and the self confidence to not only research, but also publish and distribute it the world over. Do we have the capacity to work hard and the confidence to find out whether we live in "houses" or "homes" ? Why are husbands dominating and indulge in wife beating ? Why do they always resent a "NO" from their family members ? Why are wives always depressed, frustrated and shrewish? Why do mothers cling to their sons possessively and are unable to share them with their wives ? Why are children dishonest and hypocritical ? We like to presume that God's in Heaven and all is well with the World. How can anything be wrong with some one who describes himself as a Muslim ?

Evaluating from observation of our past 43 years of history, everything is wrong. How come our family units- and it is a truism that aggregation of these units make a society and a nation - are not roducing great leader, scholars and teachers ? To make it worse, why are we so characterless ? Whey are we always camp followers of others and unable to stand on our feet and make our own decisions ? How come we not only fail to solve the Kashmir issue, we have even lost East Pakistan and `Siachin' In the absence of scientific research, this is enough of an historical pragmatic test that our families have failed and we live in "houses" and not in "homes".

The way to achieve the objective of making Pakistan a truly Islamic State is not by means of taking part in the present secular political organisation of the country but by means of REVOLUTION based on the SOVEREIGNTY of the BOOK OF ALLAH

contrary, a segregated society fosters lust, deprivation, mystery, disrespect, unhealthy curiosity and dishonesty. An open society which the Quran visualize, is composed of integrated, developed men and women with healthy minds and intellect, forthright and straight forward, dignified and mature enough to establish friendship and companionship, not only within wedlock, but outside as well (Surah 52 Vs 20; Sarah 44, Vs 54). After all sex is not the only link between men and women. Exhibitionism, for both male and female is a negation of self respect and a woman is certainly no sex symbol (I have said this in more detail in my booklet, "Woman Recreated", so I will refrain from repeating muyself). It is in a society like this that men and women will choose their partners.

From this point we move to the next stage; in Surah 4 Vs. 21 the Quran describes marriage as a "Contract". The word contract has serious implications. A contract has certain preconditions - the two parties concerned should be adult, grown up individuals, old enough to understand what the contract is all about and be able to bear its responsibilities. Secondly, a contract is sighed between equal parties, and thirdly, it must be willingly consented to. This is true of any contract. Hence the very word immediately rejects child marriage and blind, arranged marriages. This is not all. A contract willingly signed, even be willingly terminated by the parties concerned. Hence in Surah 33 vs. 28 if differences arise in ones idea and world-view, if one is no longer like-minded, then it is advisable to separate. This life has to be lived on this earth, so marriages are not made in Heaven. The marriage ties are mutually made here and can be mutually united here. Surah 4 vs. 19, does not accept force, that is, to forcibly take a woman as wife and keep her as such by force. That is the very negation of health and happiness and companionship.

There is another very intriguing aspect to this marriage syndrome. When talking about marriage by choice and mutual likeness, the Quran is directly addressing the man and woman concerned. It does not address the parents. The role of the parents as advisors, consultant, the most concerned in the situation is understandable, but arrogating to themselves the absolute power of making decisions for other adults, even if they happen to be their own biological children, on matters that concern an intimate lifelong partnership is not understandable. As I said in the beginning, children are individuals who exist on their own right as persons with a "self" The recognition of this uniqueness in creation being its Free Will. They are certainly not a mere passive extension of the parents. I almost feel like saying' Hands off your children, parents ! Let them grow up into responsible adults. If they make a mistake in their choice (as if parents don't) then the Quran has advised separation. And that is that !.

I can imagine your raising your hands in horror against what I have said. But all that I have tried to point out is that there is no linkage between our 'triditions'and 'Islam'. Conceptually, they move in the opposite directions. At

wedding ceremonies in any case are all originally that of a Hindu set-up. But the situation became, ludicrous when the "naaee" maintained the farce of introducing the father, brothers and uncles within a first cousin marriage among "Muslims".

Thirdly, with the background of the institution of "Sati", widow remarriage was irrelevant, and divorce in the Hindu law was unknown. Hence, until today, a widow and a divorcee are looked down upon as a bad omen and remarriage frowned upon and stigmatized. In fact, before Muslim family laws of 1961, it was unthinkable, an anathema.

Fourthly, as far as the children are concerned, the society is very much parent and old age orientated, and children are merely an extension of the parents. They do not exist on their own right as individuals. In fact children are just not allowed to think and feel for themselves.

Our tragedy lies in that the existing traditional family life, and the various facets of this institution whatever their heritage, Byzantine, Sassanian, or Hindu, we have totally identified these with Islam and we continually keep on justifying, rationalizing and twisting the Quranic words and concepts to suit the status quo. Unfortunately, while perched on the highest executive position, Benazir Bhutto seems to have put a stamp on it when, in her answers to repeated questions on her conventionally arranged marriage, she described it as traditional and Islamic. Ever since I can recall, these two terms, "traditional" and "Islamic" have been used simultaneously. No body stops to think; "Is everything traditional, Islamic ?" If 'Yes', then nothing will ever change. Then our Conventions, our meetings, out speeches, are superfluous.

Thanks to Allama G.A.Parwez's "Classification of the Quran". "Dictionary of the Quran" and other great works, I have been able to test this "Linkage" between 'traditional' and ' Islamic' in the light of the Quranic words and concepts and the result was a horror, for there is no "linkage". This is where "semantics" the science of words and the attempt to 'connect' contradictions play an indispensable role.

To begin with, Surah 4, Verse 3 and 19, and Surah 33, verses 52, emphasize that marriage is based on mutual likeness. Unless the desire to live together does not spring from the heart, indeed it is no marriage. This likeness is not that of physical appearance -the stupidity and childishness of seeing a photograph, having a glimpse through a hole in the curtain, or a chink in the door, makes me laugh. This likeness, as the Quran expresses, is in depth discernment of each other's personalities and possibilities and possibilities of like-minded companionship. This evaluation and description of marriage cannot be glossed over. There is much more to it than meets the eye. This kind of mutual likeness cannot originate and develop in a segregated society. On the

HOUSE OR HOME

by
Shamim Anwar

When a nation does not "Live its life", When it stops thinking and researching, then words and concepts lose their meaning. This loss of semantics or science of words, distorts our vision and world view. Another loss of an unthinking people is the absence of the art and awareness of connecting words and concepts and the various institutions we live by. Quite oblivious of it, we continue to wade through the mire of glaring contradictions smug in the self-deception that we are the "Muslim Umma" and hence the best and the chosen ones.

I have picked up today the very basic and fundamental social unit - the Family. Does this family unit manage to make merely a house of mud, bricks, stone or wood or transforms it into a "home" of living, vibrant, free, loving and wholesome members ? That is the question. Whether each one of us is living in a "house" or "home" It is for each one of us to think, feel and conclude. I am presenting the view in the way I look at it.

The family unit constructs itself on the institution of marriage, the husband and wife relationship, and its relationship within its progeny - daughters and sons. Before analysis and evaluation of this institution, it would be advisable to describe the status quo as it exists, and trace its heritage as well.

Now the society in which we live is a sexually segregated one. Although the "Mardana" (for men) and "Zanana" (for women) walls in the house are breaking down, and more and more women are seen and accepted functioning outside the house without being immediately dubbed as prostitutes, the facts remains that in the innermost depths of our subconscious such a woman is still suspect. Historically speaking, these notions of segregation and the respectability of the veiled woman are traced back to the Byzantine Civilization and its off shoot in the Russian society prior to Peter the Great. Today, the so called "Muslim" civilization is the only one that still exercises segregation and retains the phenomenon of the veild woman.

Secondly, the logical result of this is the deep rooted system of arranged marriages and its concomitant, child marriage. Although in ancient and medieval times, this was not unknown the world over, basically in South Asia, our heritage is traceable to the Hindu way of life, particularly its caste system. The "naaee" (barber) who was also a physician and surgeon, was an integral part of the family, a liaison in the inter-family scenario and caste marriages. It was hewho arranged the marriage and when, on the wedding day, the two parties met for the first time it was the "naaee" who introduced them. Our